| جلد ۴۲ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۸ء | عدد ۲ |
|---|---|---|


## مضامین

# شذرات

سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد تین برس ہوے کہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگون کا تقاضہ تھا کہ وہ جلد سے جلد چھوٹی تقطیع پر چھپ جائے، چنانچہ اب بڑی مسرت سے اطلاع دیجاتی ہو کہ اسکی چھوٹی تقطیع چھپ کر تیار ہے، جن صاحبوں کے پاس چھوٹی تقطیع کی سیرت کی جلدیں ہیں، وہ یہ جلد بھی منگوالیں، حسب دستور دو قسم کے کاغذوں پر چھپی ہے، پہلی قسم کی قیمت ؏ رہی، اور دوسری قسم کی ؏ ہے، ضخامت ۴۹۳ صفحوں کی

سیرۃ کی چھٹی جلد جو آنحضرت صلعم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہو ابھی تک زیر طبع ہی، اس وقت تک سوا چار سو صفحے چھپ چکے ہیں، سو صفحے ابھی اور چھپنے ہیں، امید ہے کہ دو تین مہینوں میں یہ چھپ کر تیار ہو جائے، اس کے شروع مین اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر ایک مفصل مقدمہ ہی،

مسند احمد بن حنبل حدیث کی سب سے بڑی کتاب ہے، چھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے، اس کی ترتیب راوی صحابیوں کے نامون پر ہو اس لئے اس میں کسی حدیث کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی، ہندوستان مین اہلحدیث کانفرنس نے اسکی ابواب پر ترتیب کی کوشش کا کئی دفعہ ارادہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی، حالانکہ پہلے بزرگوں میں سے کوئی یہ کام کر چکا ہے، اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مصر کے ایک عالم نے جو ساعاتی کے نام سے مشہور ہیں اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا ہے، اور ہر مضمون کی حدیث کو الگ الگ کیا ہے، متن کے نیچے آدھے حصہ میں حدیث کی شرح بھی کرتے گئے ہیں، سیرت کی حدیثوں کو بھی الگ جمع کیا ہی، اس وقت تک پانچ جلدین



ہندوستان پہنچی ہین، الفتح الربانی کتاب کا نام رکھا ہی،

تفسیرون مین محدث ابن کثیر کی تفسیر ایک خاص حیثیت رکھتی ہی، نواب صدیق حسن خان مرحوم نے اسکو اپنی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر چھپوایا تھا، مگر اس کی اس ضمنی حیثیت سے فائدہ پوری طرح نہیں پہنچتا تھا، اب مصر میں یہ علٰحدہ مستقل طور سے چھاپی گئی ہے، ہندوستان مین انبار غلام رسول سورتی جالی محلہ بمبئی ۳ سے ملے گی،

انبار شرف الدین بھنڈی بازار نے عربی ٹائپ کا ایک عمدہ چھاپہ خانہ قائم کیا ہے، اور فارسی وعربی کی بعض کتابیں نہایت صفائی اور خوبی سے چھاپ کر شائع کی ہیں انجملہ ان کے ایک مقدمۂ ابن صلاح ہے، طبقات ابن سعد بھی بعض ضروری تصحیح و تحشیہ کے بعد یہ مطبع چھاپ رہا ہے،

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن جو فقہ حنفی کی امہات کتب کو چھاپنے کا کام بڑی محنت سے انجام دے رہی ہے، ابھی حال میں اس نے امام محمد کی مشہور کتاب جامع کبیر کو چھاپ کر شائع کیا ہے، کتاب کے مسوّدِ و مصحح مولانا ابوالوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسۂ نظامیہ نے جس طرح ٹونک جا کر ستائیس دنون مین اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا، اور مصر و قسطنطنیہ سے اسکے عکسی نسخے منگوا کر مقابلہ اور تصحیح و تحشیہ کی خدمت انجام دی وہ علمائے سلف کی محنتوں کو یاد دلاتی ہے، کتاب انبار غلام رسول جالی محلہ بمبئی نمبر ۳ سے ملیگی،

خوشی کی بات ہے کہ ایران میں بھی ہماری بعض مستند ہندوستانی کتابوں کے ترجمے شروع ہو گئے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا حالی کی حیات سعدی اور مولانا شبلی کی شعر العجم کے فارسی ترجمے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، اور شاید شمس العلماء آزاد کی سخندان پارس کا بھی، امید ہو کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان وہ علمی تعلق پھر پیدا ہو جائیگا،

جو سو ڈیڑھ سو برس سے منقطع ہو گیا ہے،

---

ایران میں آجکل قدیم عربی و فارسی کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے، محاسن اصفہان، تتمۂ یتیمۃ الدہر، حدود العالم (جغرافیہ) التوسل الی الترسل، تحفۂ سامی اور بہت سی مفید کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں، کتبخانۂ دانش طہران نے ہمارے پاس بعض کتابیں اس غرض سے بھیجی ہیں کہ اہل شوق ان کو خرید سکیں، ان کی فہرست معارف میں شائع ہو گی،

---

بمبئی کے بعض پرجوش مسلمانوں نے جنمیں حاجی قاسم علی جیراج بھائی کا نام خاص طور سے ذکر کے قابل ہی، اسلام پر مفید انگریزی و اردو و گجراتی کتابوں کا سلسلہ ایک ادارہ کی طرف سے قائم کیا ہے، جس کا نام "مسلم مشن اینڈ لٹریری ٹرسٹ" رکھا ہے، ابھی حال میں "محمد صلعم" کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب ۳۰۰ صفحوں کی ضخامت میں شائع کی ہے، جس پر ہز ہائینس آغا خاں نے مقدمہ لکھا ہی،

---

بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لئے نہیں ہی کہ اس سے بچپن ہی میں ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے گا، بلکہ اس لئے ہی کہ اس عمر کی تعلیم کا نقش اُن کی زندگی میں ہمیشہ کیلئے قائم رہ جائیگا، مسلمانوں کا ایسی اہم عمر کی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا عملاً اپنے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہی جب جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا، اُسکے معنی یہ ہیں کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہی کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں، یا یہ ہی کہ مسلمان آیندہ عملاً مسلمان نہ رہیں، اس مشکل کا حل صرف اختلاف اور شور و غوغا نہیں ہی، بلکہ سنجیدگی کیساتھ معاملہ پر غور کرنا، اور پوری مستعدی کے ساتھ پورے ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم مرتب کرنا، اور اس پر عمل کرنا، یہ یاد رہی کہ اگر ہم اس نیم آزاد حکومت سے اپنی اسکیم نہیں منوا سکے، تو پھر پوری آزاد حکومت سے منوانے کی طاقت ہم میں کہاں سے آجائیگی؟ جو کچھ کرنا ہی سفر کی پہلی ہی منزل میں کرنا چاہئے، تاکہ آیندہ غلط روایت کی دلیل نہ پیدا ہونے پائے،

---



# مقالات

## اسلامی نظامِ تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

**فن حدیث کی درسی کتابیں،**

ہر فن کی تعلیم کے لئے اس عہد تک کی تصنیف کی ہوئی معیاری کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، مثال کے طور پر فنِ حدیث کی درسیات ذیل میں پیش ہیں،

فن حدیث کے تحصیل کے معنی حدیث کے اسناد، رجال، معنی، لغت اور تاریخ پر عبور حاصل کرنے کے تھے، علم حدیث کا جو کم سے کم نصاب مقرر تھا، اسمیں پہلے صحیح بخاری پڑھاتے تھے پھر صحیح مسلم اسکے بعد مشہور کتابیں موطا امام مالک، سنن ابی داؤد، نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، مسند شافعی (احناف کو موطائے محمد) لازمی طور پر پڑھائی جاتی تھیں[۱] خصوصاً صحاح ستہ میں سے کوئی کتاب چھوڑی نہ جاتی تھی، چنانچہ اکثر محدثین کے حالات میں ان کے پڑھنے کا ذکر آتا ہے، مثلاً امام نووی کے حالات میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں،

"کتب ستہ (صحیح بخاری، مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ،) مسند ابن حنبل،
موطا، شرح السنہ بغوی، سنن دار قطنی، اور بہت سی کتابیں سنیں[۲]"

ان صحاح و سنن کی قرأت اور سماع کے بعد علم حدیث میں بصیرت پیدا کرنے کے لئے سنن بیہقی اور مسند احمد بن حنبل، ابن حمید و بزاز وغیرہ پڑھتے تھے، کسی محدث کے لئے ان مذکورہ بالا صحاح، سنن اور مسانید سے کم پر اکتفا کرنے کی اجازت نہ تھی[۳] اسی کے ساتھ اصول حدیث میں خد

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۲۷ تا ۱۲۹، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ صفحہ ۲۵۱، [۳] تذکرۃ السامع ص ۱۲۹،

کتابیں لازمی تھیں، مثلاً کتاب العلل دارقطنی، کتاب المؤتلف والمختلف امیر ابونصر بن ماکولا کتاب وفیات الشیوخ حمیدی، اور معرفۃ علوم الحدیث حاکم[۱]

پھر جو لوگ علم حدیث میں اعلیٰ بصیرت پیدا کرنی چاہتے تھے، وہ اس زمانہ میں بھی حدیث کی طلب کے لئے سفر کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے تھے، اور مختلف محدثین سے کتابیں اور روایتیں پڑھتے اور سنتے تھے، مثلاً ابن عساکر ابواسحاق ابراہیم بن احمد نیشاپوری ان کے متعلق لکھتا ہے "کبرسنی میں علم حدیث حاصل کیا، نیشاپور میں روایتیں سنیں، پھر نسا رگئے، جہاں حسن بن سفیان سے مسند ابن مبارک اور مسند ابن ابی شیبہ اور انتخاب ابوبکر بن علی، سُنی"[۲]۔

اسی طرح اس زمانہ کے بہت سے اہل علم کے سوانح میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاکر حدیثیں سننے کے حالات تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ابن عساکر، ابن خلکان، الدرر الکامنہ ابن حجر اور شذرات الذہب ابن عماد حنبلی میں پائے جاتے ہیں،

فن حدیث کی معیاری تحصیل

فن حدیث کی معیاری تحصیل اور "محدث" کا لقب پانے کے لئے چند امور ضروری سمجھے جاتے تھے،

۱۔ صحیح احادیث کا معتدبہ حصہ برزبان ہو،

۲۔ حدیث کے جملہ اقسام صحیح، حسن، ضعیف و مرسل و مسند وغیرہ پر کامل عبور ہو،

۳۔ علم درایت سے پوری آگاہی ہو یعنی حدیث کے الفاظ اور معانی پر اس حیثیت سے کامل نظر ہو، کہ وہ عربی قواعد اور شرعی ضوابط کے لحاظ سے واقعی قول رسول صلعم معلوم ہو، چنانچہ ابن جماعہ محدث کی تعریف میں فرماتے ہیں :۔

"محدث وہ ہے جو اسانید و علل واسماے رجال پر حاوی ہو، متون حدیث ذک

[۱] وفیات الاعیان جلد ا ص ۴۱۲، [۲] ابن عساکر،



زبان ہوں، اور کتابوں میں سے صحاح ستہ، مسند احمد، سنن بیہقی، اور معجم طبرانی کم سے کم سن چکا ہو"[۱]

دیگر علوم کی درسیات،

جس طریقہ سے علم حدیث کی یہ کتابیں مقرر تھیں، اسی طریقہ سے دوسرے شرعی ادبی اور عقلی علوم کا نصاب بھی مقرر تھا، ان علوم میں بھی اسی طریقہ سے مثلاً پہلے اشعار و دواوین یاد کراتے صرف ونحو کے اہم مسائل ذہن نشین کراتے، اور ادب و شعر میں ملکہ پیدا کرتے تھے، عقلیات میں بھی پہلے مبادیات حفظ کرتے، پھر کتابیں پڑھتے، ان کی شرحوں سے گذرتے، اور علوم سائنس میں بھی مبادیات کی تحصیل کے بعد عملی طور پر سائنٹفک تجربے کرتے، اور ایجادات اور اکتشافات میں لگے رہتے تھے،

مثلاً ابن ابی اصیبعہ اپنے چچا رشید الدین علی بن خلیفہ طبیب کی تحصیل علم کی تفصیل بیان کرتا ہے، کہ "انھوں نے پہلے ابوالبقی صالح بن احمد قرشی مقدسی سے جو بچوں کو تعلیم دینے میں ماہر تھے، قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم حساب پڑھا، پھر جمال الدین بن ابی الحوافر کی خدمت سے وابستہ ہو کر علم طب کی تحصیل شروع کی، اور جالینوس کی کتابیں پڑھیں، اور اس فن کے مبادیات حفظ کئے، پھر اطبا کی جماعت میں حاضر رہنے لگے، اور بیمارستان میں عملی تجربہ اور امراض کی قسموں کی تعلیم حاصل کرتے رہے، اور علاج ومعالجہ کا طریقہ سیکھتے رہے، پھر اسی اثنا میں علم امراض چشم کی تعلیم حاصل کی، اور قاضی نفیس الدین ابن زبیر سے جو بیمارستان کے شعبہ چشم کے افسر اعلیٰ تھے، اس فن کو عملی حیثیت سے سیکھا، پھر اسی طرح آپریشن کرنے کی تعلیم اور مشق بہم پہنچائی، اور نیز دوسرے علوم کی مہارت کیلئے موفق الدین عبداللطیف بن یوسف بغدادی اور سدید الدین منطقی سے سلسلۂ تعلیم جاری کیا، اور ان سے ادب فلسفہ اور منطق کی تحصیل کی، نیز علوم نجوم کی تحصیل ابومحمد بن جدی سے کی، اور فن موسیقی کی تعلیم ابن دیجور مصری سے پائی، اور بیس سال کی عمر میں ان تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کرلی، اُد

[۱] مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص ۳ بحوالہ طبقات الشافعیہ سبکی،

شام ہو نجٔ مطب شروع کر دیا، اس کے بعد پانچ سال مزید تحصیل میں صرف کئے، اور بچیس سال کی عمر میں ماہر کامل بن گئے[1]،

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اپنے تحصیلِ علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں طلبہ کس ترتیب سے پڑھتے، نصاب کی کتابوں اور ان کے حواشی و شروح کے متعلق کیا سمجھتے تھے، تعلیم کی مدت کیا تھی، اور تعلیم میں اصل مطمحِ نظر کیا رہتا تھا، اور تعلیم و تعلم کا کیا طریقہ رائج تھا، فرماتے ہیں:-

"اول از قرآن مجید متسابقۃً تعلیم فرمودند سبق درسبق ایشان می نوشتند، و من می خواندم از قرآن ہمیں مقدار تعلیم کردہ ام بعد ازان باثر تربیت و شفقت ایشاں چناں قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم و ہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان میگذرانیدم، در دو سہ ماہ ختم قرآن تمام کردم،

و در خط و سواد چنانچہ معلمان جلیل اطفال را در مکتبہا یاد دہند، مفید نشدند، فقیر را تا فی وقتنا بطریقۂ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند بعد ازان بطریق اجمال در اندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعیین کنیم در دروغ نگفتہ باشم قدرت کتابت و سلیقۂ انشا پیدا شد،

و از کتاب ہائے نظم و اشعار کہ تعلّم آن متعارف این دیار است شاید کہ چند چیز جزو از بوستان و گلستان و دیوان حافظ تعلیم کردہ باشند، و ہم از ابتدار حالت صغر بعد از ختم قرآن میزان صرف یاد دادند تا مصباح و کافیہ خود تعلیم فرمودند، ..... و گاہے کتابہا را تعداد می کردند و می فرمودند ہمین چند کتاب را کہ خواندہ دانشمند شدی،

می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخوان تا پسندیدہ است، بعد ازان انشاء اللہ چنان ابواب برکت و سعادت بر تو بکشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روئے نماید، ..... از مختصرات نحو مثل کافیہ، و لب و ارشاد، شاید کہ در بعضے اوقات یک یک جزو بلکہ بیشتر خطے می نمودم بلکہ بسبب حرص و شوقیکہ بر اتمام تحصیل و فراغ داشتم، چنان بودم کہ اگر جزوے از زین مختصرات مصحح و محشی بدست می افتاد، بگذرانیدن آن پیش اوستادمی پرداختم، و کلی از مطالعہ کہ دران اوان بنظر در حواشی دست می داد اکتفا کردہ، بجزو دیگر می انداختم، .. بمقید نہ بودم کہ شروع از اول کتاب باید نمود، و اختتام بآخران کہ مطمح نظر تحصیل علم بود، ہر نوع کہ باشد دوازدہ یا سیزدہ سالہ بودہ ام کہ شرح شمسیہ و شرح عقائد می خواندم و پانزدہ یا شانزدہ کہ مطول و مختصر را گذرانیدم و بیشتر یا پستر بیک سال از عددے کہ ظرفا در شمار عمر از ذکران ملاحظہ کندہ از علوم عقلی و نقلی انچہ در افادہ و استفادہ از صورت و مادہ کافی و وافی باشد تمام کردم، ..... و بالجملہ ہمیں قیاس کہ بر خواندم بر سائر کتب عبوری کردم و عشوری نمودم، غیر آنکہ مدت ہفت ہشت سال بلکہ زیادہ بعد از رسیدن بکتب عربیت و منطق و کلام و حصول نوعے از قوت اکمال و اتمام ملازمت درس بعضی از دانشمندان ماوراء النہر بطورے نمودہ شد کہ در تمامی شب و روز شاید کہ دو سہ ساعت از مطالعہ و تعقل و اشتغال فرصتے دست نمی دادہ باشند[2]،

مولینا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے رسالہ وصیت نامہ میں تعلیم کے طریقہ اور کتابوں کی ترتیب پر خیالات ظاہر کئے ہیں، کہ یہ ان کا آزمودہ طریقہ ہے، اس سے اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلیمی طریقے اور کتابوں کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے، مولانا ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم نے اسے اپنے رسالہ "اسلامی درسگاہیں" میں نقل کیا ہے، اسکو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

[1] عیون الانبا جلد ۲ ص ۲۴۷، ۲۴۸،

[2] اخبار الاخیار ص ۲۹۰ تا ۲۹۲،

طریق تعلیم علم چنان کہ بہ تجربہ محقق شد آن ست کہ نخست رسائل مختصرہ صرف و نحو درس گویند سہ نسخہ از ہر یکے یا چہار چہار بقدر ذہن طالب بعد ازان کتابے از تاریخ یا حکمت عملی کہ بزبان عربی باشد آموزند و دران میان بطریق تتبع لغت برآوردن مشکل از جائے آن مطلع سازند، چون قدرت بزبان عربی یافت موطا بروایت یحیٰی بن یحیی مصمودی بخوانند، و ہرگز آن را معطل نگذارند، کہ اصل علم حدیث ست، و خواندن آن فیضہا دارد ما را سماع جمیع آن مسلسل ست، بعد ازان قرآن عظیم درس گویند، بآن صفت کہ صرف قرآن خواند، بغیر تفسیر و ترجمہ گوید و آنچہ مشکل باشد، در نحو، یا در شان نزول متوقف شود و بحث نماید، بعد فراغ از درس تفسیر جلالین را بقدر درس بخوانند، درین طریق فیضہا است بعد ازان در یک وقت کتب حدیث بخوانند مانند صحیحین و غیر آنہا و کتب فقہیہ و عقائد و سلوک و در یک وقت کتب دانشمندی مثل شرح ملا جامی و قطبی و غیر آن الا ماشاء اللہ و اگر متیسر آید کہ مشکوٰۃ را یک روز بخوانند در روز دیگر شرح طیبی بقدر آنچہ روز اول خواندہ است بخوانند خیلے نافع ست[1]"

**تکمیل علوم کے چند لازمی طریق**

ساتویں آٹھوین صدی میں طالب علمون کے لئے فنون کے مبادیات کے حفظ کرنے کے بعد مختلف فنون کی تکمیل کیلئے حسب ذیل طریقوں پر عمل کرنا ضروری تھا، اور تا وقتیکہ کوئی طالب علم ان منزلون سے گذر نہ لے اسے صاحب فن کا درجہ حاصل نہ ہوتا تھا،

۱- اساتذہ کے درس کے حلقہ میں زبانی خطبوں کا سلسلہ اس عہد میں بھی جاری تھا، طلبا ان میں التزام سے شریک ہو کر املا کرتے تھے،

۲- اس عہد میں اساتذہ سے ہر فن کی اہم کتابون کے سبقاً سبقاً پڑھنے کا طریقہ جاری ہو گیا

[1] اسلامی درسگاہیں، ص ۱۰۷، ۱۰۰۔



تھا، اور طالب علمون کے لئے ضروری تھا، کہ وہ ہر فن کی معیاری (کلاسیکل) کتابیں استادوں سے پڑھیں، اور ان کی قرأت اور سماع کی سند اور اجازت حاصل کرین،

۳- طلبہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا، کہ وہ اپنے استادون سے اجازت لینے کے بعد علم کی تحصیل کے لئے دور دراز کے سفر طے کرین، چنانچہ طلبہ اپنی جماعت کی جماعت تیار کرتے تھے، اور مختلف شہروں میں گھوم کر وہاں کے ممتاز اہل علم سے علوم میں بصیرت پیدا کرتے تھے،

۴- ہر طالب علم کے لئے اپنے عہد کے بلند پایہ مصنفین سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا ضروری تھا، اس کے مدرسہ کے جو اساتذہ صاحب تصانیف ہوتے، ان سے انکی کتابیں پڑھ کر ان کی قرأت اور سماع کی سند حاصل کرتے تھے، پھر اپنے علمی سفروں میں زیادہ تر علم کی تحصیل اسی ذریعہ سے کرتے، ہر شہر میں جو ممتاز اساتذہ اور مصنفین ہوتے تھے ان کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر ان کی کتابوں کی اجازت و سند حاصل کرتے تھے، کسی کتاب کا پڑھنا، اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک اس کے مصنف سے یا اس کے شاگرد، یا شاگردوں کے شاگرد سے اس کے پڑھنے کی اجازت حاصل نہ کر لی جاتی،

۵- طلبہ جب تک علوم میں پوری بصیرت پیدا نہ کرتے، وہ اختلافی مسئلون کا مطالعہ نہ کرتے تھے، جب انھیں اپنے علم پر بھروسہ ہو جاتا، تو پھر نظر کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے خلافیات کا مطالعہ کرتے تھے،

۶- جب علمی استعداد کمال کے درجہ پر پہونچ جاتی، اور فن کی اکثر کتابیں نگاہوں سے گذر جاتیں تو پھر درس و افتار کی مسند پر بیٹھتے تھے، اور اپنی تصنیف اور تالیف کے ذریعہ سے فیض جاری کرتے تھے، اسی سلسلہ میں علمائے اسلام کے اختلافی مسئلوں پر تحقیق کی نظر ڈالتے تھے، اور اگر ضرورت ہوتی تو ان خلافیات پر اپنی تصنیفات میں مصنفانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے،[1]

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۳۳ تا ۱۴۲ و ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۹۔

(۸)

## طرزِ تعلیم و نصابِ درس کی چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں اور انکی اصلاح کی کوششیں

امتدادِ زمانہ سے اسلامی طرزِ تعلیم و نصابِ درس میں چند خامیاں پیدا ہوئیں اور مختلف زمانوں میں ان کی اصلاح کی کوششیں کی گئیں، جب اسلامی حکومتوں کے شباب کا دور آیا، اور علما بھی حکومت کے مختلف منصبوں، افتا، قضا، خطابت اور اوقاف کی تولیت وغیرہ پر مقرر کئے جانے لگے، تو چوتھی پانچویں صدی ہجری سے لوگوں کی توجہ علم فقہ پر زیادہ مبذول ہو گئی تھی، اس کے علاوہ فقہ میں مختلف مذہبوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے خلافیات کے نام سے اس علم میں ایک مستقل باب کا اضافہ ہو گیا تھا، اور تعلیم و تعلم میں بھی انہی چیزوں پر توجہ کیجانے لگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مدرسوں کے نصابِ تعلیم میں خلافیات کے رسائل زیادہ داخل ہو گئے، اور دوسرے علوم کی طرف توجہ کم ہو گئی،

امام غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان خامیوں کا احساس کیا، اور احیاء العلوم میں ان پر تفصیل سے نظر ڈال کر ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائیں جنھیں مولینا شبلی مرحوم نے "تعلیم کی اصلاح" کے عنوان سے الغزالی میں مفصل بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱- امام غزالی نے مذہبی اور غیر مذہبی علوم کی تقسیم کر کے جو مختلف علوم مذہبی سمجھے جانے لگے تھے، ان کی تردید کی، اور ضروری علوم پر توجہ کیا،

۲- خصوصاً علم فقہ کو جو اس زمانہ میں معیشت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا، دنیاوی علوم میں شمار کیا،

۳- شرعی علوم کے غلط استعمال سے روکا،

۴- فقہی و کلامی مناظروں سے باز رکھ کر صحیح علم کلام کے حاصل کرنے کی تلقین کی،



۵- ان شرعی علوم کے لئے ایک مختصر نصابِ تعلیم تیار کیا جن کی تحصیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے،

امام غزالی کی اصلاح کی اس آواز کا نتیجہ آگے چل کر مولینا شبلی مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ظاہر ہوا:-

"تعلیم کے نصاب میں فقہ و کلام کے ساتھ منطق و فلسفہ داخل ہو گیا، دنیوی علوم کے لئے اتنا کافی وقت نکل آیا، کہ فقہاء و محدثین بھی ریاضی دان اور حساب دان ہونے لگے، فقہ میں سے علم اختلافیات کا حصّہ بالکل خارج ہو گیا، کلام کے بہت سے غیر ضروری مباحث چھٹ گئے"[۱]

پھر آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون نے چند اصلاحیں پیش کیں، ان سے اس عہد کی خامیوں کا بھی اندازہ ہو گا، مثلاً

۱- تعلیم کی ابتدا، قرآن مجید سے شروع کرنے کا عام رواج اصلاح کے قابل ہے،

۲- جو علوم دوسرے علوم کے حاصل کرنے کے ذرائع ہوں، ان میں نہ زیادہ دقت نظر پیدا کیجائے، اور نہ اس کے فروعی مسئلوں پر وقت صرف کیا جائے،

۳- کتابوں اور علوم کے جو مختصرات تیار کئے گئے ہیں، ان پر علم کی تحصیل کی بنیاد نہ قائم کیجائے،

۴- ایک ہی فن کی ایک ہی قسم کی بہ کثرت کتابیں پڑھانا نہ صرف تضیعِ اوقات بلکہ مانعِ تحصیلِ علم ہے،

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے

بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع کرانے کا طریقہ اگرچہ تمام اسلامی ملکوں میں رائج تھا، لیکن بعض اہلِ علم اُسے اسلئے محلِ نظر سمجھنے لگے تھے، کہ بچوں کو ان کی بے سمجھی کے زمانہ میں خدا کی کتاب پڑھائی جائے، چنانچہ ابنِ خلدون نے قاضی ابو بکر ابن عربی کے حوالہ سے اس مسئلہ پر ذیل کے خیالات ظاہر کئے ہیں:-

[۱] الغزالی از ص ۲۱۱ تا ۲۲۰، ان مباحث کی تفصیل کے لئے دیکھئے احیاء العلوم جلد ۱، از ص ۹ تا ۳۲،

"قاضی ابوبکر بن عربی نے اپنے سفرنامہ میں طرز تعلیم کے متعلق ایک نادر طریقہ پیش کیا ہے، وہ عربیت اور شعر کی تعلیم کو تمام علوم کی تعلیم پر مقدم کرتے ہیں، جیسا کہ تقریباً اہل اندلس کا طریقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ پہلے شعر و ادب کی تعلیم دینا چاہئے، پھر حساب لکھا کر اسکی مشق کرانی چاہئے، یہانتک کہ وہ اصول و قوانین کو سمجھ سکے، اس کے بعد قرآن پڑھانا چاہئے، کیونکہ اس ترتیب سے پڑھنے سے قرآن اس کے لئے آسان ہو جائے گا، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہموطنون کی غفلت پر ماتم ہے، کہ وہ بچہ کے ہاتھ میں شروع ہی میں خدا کی کتاب پکڑا دیتے ہیں، اور وہ ایسی چیز پڑھتا ہے، جسے بالکل نہیں سمجھ سکتا

اس کے بعد وہ کلام پڑھانے کے لئے کہتے ہیں، پھر اصول فقہ، پھر مناظرہ اس کے بعد علوم حدیث کا درجہ دیتے ہیں،

اس کے ساتھ دو علموں کو ملا کر پڑھانے کی ممانعت کرتے ہیں، البتہ اگر طالب علم اپنی تیزی اور ذکاوت سے اس قابل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس کے بعد وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے، کہ

در حقیقت یہ ایک عمدہ طریقۂ تعلیم ہے، لیکن جو عادتیں جاری ہیں، ان کا بدلنا دشوار ہے، اور لوگ قرآن مجید کی تعلیم کو مقدم تبرک اور ثواب کی نیت سے کرتے ہیں، اس کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ آگے چل کر ممکن ہے بچہ کی تعلیم جاری نہ رہ سکے تو قرآن کی تعلیم کا موقع نہ مل سکے گا، خصوصاً اس لئے کہ بچے بچپن میں والدین کے مطیع رہتے ہیں، بالغ ہونے کے بعد والدین کا اختیار ان پر باقی نہیں رہتا، اس لئے اگر وہ تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر دینگے، تو قرآن کی تحصیل کا فرض باقی رہ جائے گا،

لیکن جس بچہ کے متعلق یہ یقین ہو کہ اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع نہ ہوگا، تو قاضی ابوبکر نے جو طریقۂ تعلیم بیان کیا ہے، اسے اختیار کرنا بہتر ہوگا۔"[1]



**علوم غیر مقصود بالذات کو مقصود بالذات بنانیکی مخالفت**

ابن خلدون ان علوم پر جو دوسرے علوم کے پڑھنے کے وسیلہ کے لئے پڑھائے جاتے ہیں، اور جنھیں اس نے علوم آلیہ کی اصطلاح سے یاد کیا ہے، کم توجہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے، وہ لکھتا ہے،:-

"متداول علوم کی دو قسمیں ہیں، ایک مقصود بالذات ہیں، جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام طبیعیات، الٰہیات، اور ایک وہ علوم ہیں جو ان کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، جیسے قواعد عربی، حساب منطق، پس جو علوم مقصود بالذات ہیں، اگر ان میں کلام کو وسعت دیجائے، تو کوئی حرج نہیں، لیکن جو علوم دوسرے علوم کا آلہ ہیں، جیسے قواعد عربی اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہئے، کہ وہ آلہ ہیں، اس لئے ان میں کلام کو وسعت نہ دینی چاہئے، کیونکہ اس سے ان کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا، اور علوم مقصود بالذات کی تحصیل میں رکاوٹ پیدا ہوگی، حالانکہ وہی اہم ہیں، اور اس طریقہ سے طالب علم کی عمر ان سب کی تحصیل کے لئے کافی نہ ہوگی، کیونکہ ان علوم آلیہ کی مصروفیت میں عمر ضائع ہو جائیگی، جیسا کہ متاخرین نے نحو، منطق، اور اصول فقہ کے متعلق کیا ہے۔"[2]

**مختصرات سے اجتناب**

ہر فن کے مسئلوں کے سمیٹنے کے لئے "مختصر" کے نام سے جو رسالے لکھے جاتے تھے، ان کے متعلق کہتا ہے،:-

"اکثر متاخرین نے علوم و فنون کے طریقے کو مختصر کر دیا ہے، اور ہر علم کی ایک مختصر سی فہرست مرتب کر لی ہے، جو مختصر لفظوں میں اس کے تمام مسئلوں اور دلیلوں پر مشتمل ہوتی ہے، ان لوگوں نے تفسیر اور بیان کی بڑی بڑی کتابوں کا اختصار کر لیا ہے، جیسا کہ ابن حاجب نے فقہ و

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰، ۶۱۹، [2] ص ۶۱۵،

اصول فقہ میں ابن مالک نے قواعد عربی اور خونجی وغیرہ نے منطق میں کیا ہے، لیکن تعلیم کا یہ طریقہ نقصان دہ ہے، اور اس سے تحصیل میں خلل پڑتا ہے، تمام خرابیوں کے ساتھ طالب علم کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ انھیں مشکل اور مختصر الفاظ کا تتبع کرنا پڑتا ہے، اور ان میں سے دشواری کے ساتھ مسائل کو نکالنا پڑتا ہے، ان تمام خرابیوں کے علاوہ ان "مختصرات" کی تعلیم سے جو ملکہ علمی حاصل ہوتا ہے، وہ اس ملکہ سے ناقص ہوتا ہے، جو طویل الذیل کتابوں کے پڑھنے اور ایک بات کے بار بار دہرانے سے حاصل ہوتا ہے"[1]

**ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابوں کی تعلیم کے نقصانات**

ایک ہی فن کی بہ کثرت کتابیں پڑھنے کی مخالفت میں اس نے دکھایا ہے کہ کتابوں کی زیادہ تصنیف علم اور تعلیم کی ترقی میں مانع ہے، لکھتا ہے

"لوگوں کو علم کی تحصیل میں جس چیز نے نقصان پہنچایا ہے، وہ کتابوں کی کثرت، اصطلاحوں کا اختلاف، تعلیم کے طریقوں کا متعدد ہونا، اور پھر طالب علم سے ان کے یاد کرنے کا مطالبہ کرنا ہے، جو کچھ ایک فن کے متعلق لکھا گیا ہے، طالب علم کی عمر اسی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسلئے علم کی تحصیل میں خواہ مخواہ کوتاہی واقع ہوتی ہے، فقہ مالکی میں اس کی مثال مدونہ اور اس کی شرحیں ہیں، ابن یونس لخمی، ابن بشیر وغیرہ کی کتابیں اور تنبیہات و مقدمات بیان وغیرہ، یہی حال، ابن حاجب کی کتابوں اور اس کی شرحوں کا ہے، یہ تمام کتابیں مکرر ہیں، اور معنی سب کے ایک ہیں، لیکن طالب علم سے سب کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اور عمر صرف ایک ہی کتاب میں گذر جاتی ہے،

اگر اساتذہ صرف مذہبی مسائل پر اکتفا کرتے، تو تعلیم آسان ہو جاتی، اور اس کا ماخذ قریب ہو جاتا"[2]

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۰، [2] ۔ صفحہ ۶۰۹،



**طریقہ تعلیم کے متعلق ابن خلدون کے چند مفید مشورے**

ابن خلدون نے طریقہ تعلیم کی مذکورۂ بالا خامیاں مٹانے کے علاوہ چند مفید مشورے بھی دیئے ہیں، جو اجمالاً حسب ذیل ہیں، لکھتا ہے

" طالب علموں کے لئے علوم کی تلقین اسوقت مفید ہو سکتی ہے، جب وہ تھوڑا تھوڑا تدریجاً پڑھائے جائیں، پہلے ہر فن کے چند اصولی مسئلے ذہن نشین کرائے جائیں، پھر اجمال کے ساتھ ان کی شرح بیان کی جائے، اور اس میں ان کی قوت فہم اور استعداد ملحوظ رکھی جائے، یہاں تک کہ فن کے آخری حصے انھیں سمجھائے جائیں، اس وقت ان میں اس فن کے متعلق ایک قسم کا ملکہ پیدا ہوگا، اور اس کی غایت یہ ہوگی، کہ وہ اس فن کے سمجھنے اور اس کے مسائل حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، پھر دوسرے فن کی جانب رجوع کیا جائے، اور اسی ترتیب سے وہ فن بتدریج انھیں پڑھایا جائے، اور پھر شرحوں وغیرہ سے گذر کر اس کے اختلافی مسائل سمجھائے جائیں، یہانتک کہ وہ فن کو پورے طور پر حاصل کر لیں، اور اس طریقہ سے تدریجاً ان میں عمومی علمی ملکہ پیدا ہو جائیگا اور اگر شروع ہی میں انتہائی مسائل ان پر بار کر دیئے جائیں گے، تو رفتہ رفتہ ان کی طبیعت چھوٹ جائے گی اور بالآخر وہ تعلیم سے منہ موڑ لیں گے"

اسی طرح فنون کی تحصیل میں ناغہ کرنا مناسب نہیں، ورنہ اس کی وجہ سے فن کا آخری حصہ اول سے منقطع ہو جائیگا، اور طلبہ کو دشواری پیش آئیگی، اور پراگندگی خاطر لاحق ہوگی"[1]

قاضی ابن جماعہ نے بھی اپنی کتاب میں جابجا مفید تعلیمی مشورے دیے ہیں، جیسے تعلیم کیلئے اساتذہ کو بار بار نہ بدلا جائے، ایک کتاب میں پوری بصیرت حاصل کر لیجائے، پھر دوسری کتاب شروع کیجائے[2]، کتابوں کو حفظ کرنے سے پہلے ان کی دیکھ بھال کر پوری تصحیح کر لیجائے[3]، علم

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۱۱۰، [3] رر صفحہ ۱۲۱،

کو کتاب میں منحصر نہ سمجھا جائے، کیونکہ علم صرف کتاب سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ استاذ سے شکوک رفع کرنے اور خود تحقیق و تفتیش کرنے سے مسائل حل ہوتے ہیں[1]، اور دو فنون بیک وقت حاصل نہ کئے جائیں، بلکہ یکے بعد دیگرے پڑھنا چاہئے[2]،

**عالمِ اسلامی میں جدید تعلیمی انقلاب**

اسلامی طریقِ تعلیم کی جن خامیوں کی طرف امام غزالی اور علامہ ابن خلدون نے توجہ دلائی ہے، وہ دورِ آخر تک ہندوستان کی اسلامی درس گاہوں میں بھی باقی تھیں، خصوصاً نصابِ تعلیم میں غیر معمولی ابتری پیدا ہو گئی تھی، طالب علموں کی عمریں علومِ آلیہ ہی کے پڑھنے پڑھانے میں ضائع کر دیجاتی تھیں، اور شرعی علوم قرآن، حدیث اور نقدِ رجال وغیرہ پر کم توجہ صرف کیجاتی تھی، فقہ و کلام میں بھی سارا زور خلافیات پر صرف ہوتا تھا، اور فقہی اور کلامی مسائل پر علماء کی باہم تفسیق و تکفیر کی عام گرم بازاری تھی، پھر جدید علوم و فنون کی تحصیل اگر کفر نہیں تو درجہ فسق تک علی گڈھ کی جدید تعلیمی تحریک کے باوجود باقی رہ گئی تھی، کہ اسی اثناء میں مجلس ندوۃ العلماء کی صدائے اصلاح بلند ہوئی، اور اس کی توجہ خصوصاً ذیل کے اہم مسائل پر مرکوز رہی،

۱- نصابِ تعلیم کی اصلاح کرنا،

۲- باہمی فرقہ وارانہ اختلافات اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر کو روکنا،

۳- بقدرِ ضرورت دینی علوم کیساتھ نئے فنون کی تعلیم دینا،

پھر ان مقاصد کے پورے طور پر حاصل کرنے کے لئے اس مجلس نے دار العلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، تاکہ ان اصولوں کے بموجب تعلیم کا صحیح طریقہ رائج ہو، دار الاقامہ کے لڑکوں کی اسلامی اخلاق کے بموجب تعلیم و تربیت کیجائے، اور اس مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء ملت کی نئی ضرورتوں سے آشنا رہکر انھیں پوری کریں،

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۲۳ و ۱۲۴ [2] ایضاً صفحہ ۵،



یہ شکر کا مقام ہے، کہ آج نصف صدی کے بعد ہندوستان میں اس مجلس کی اصلاح کی صدا کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، آج ہندوستان میں نہ صرف دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کا نیا نصاب جاری ہے، بلکہ تدریجاً دوسرے اسلامی مدرسوں نے بھی کم و بیش اس کی یہ دعوت قبول کر لی ہے، اور ہر مدرسہ کے نصابِ تعلیم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی رونما ہو چکی ہے،

فرقہ وارانہ اختلافات اور باہمی تفسیق و تکفیر فقہ اور کلام کے خلافیات کے باب سے پیدا ہوئے تھے، ندوۃ العلماء کو اس کے دوسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ ہندوستان کے مختلف اسلامی فرقہ والوں میں باہمی رواداری کا تخیل پیدا ہو چکا ہے، اور تکفیر و تفسیق کے باب میں اگرچہ علمائے زمانہ کی زبانیں اب بھی کبھی کبھی کھل جاتی ہیں، اور مکفرین کا ایک مختصر گروہ مستقل طور پر موجود ہے، تاہم انکے فتووں کا اثر صرف زبان قلم سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بدنما داغوں کے چھوڑ جانے کے سوا اور کوئی ظاہر نہیں ہوتا، اسلامی ہند کا سنجیدہ خیال تعلیم یافتہ طبقہ تکفیر کے ان فتووں کو وقعت نہیں دیتا، اور یہ فتاوی عقائد کی اصلاح کرنے کے بجائے تمسخر و استہزا کا ذریعہ بن جاتے ہیں،

اسی طرح اسے تیسرے مقصد میں بھی کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ آج ملک میں ندوۃ العلماء کے بہ کثرت اور دوسرے مدارس کے خال خال فارغ التحصیل علماء، قدیم و جدید دونوں علوم کے حامل نظر آتے ہیں،

اسی طرح دیگر اسلامی ممالک میں بھی تعلیمی انقلاب برپا ہوئے، کہیں ندوۃ العلماء کی صدائے بازگشت کے طور پر، اور کہیں زمانہ نے ہوا کا رُخ خود پلٹ دیا، مصر میں شیخ جمال الدین افغانی مرحوم کے مسند نشین علامہ رشید رضا نے جنھوں نے اسی سال [illegible] دارِ فانی کو الوداع کہا، نہ صرف ہندوستان آکر ندوۃ العلماء کی تحریک میں عملی حصہ لیا، بلکہ مصر واپس جاکر انھوں نے دار الدعوۃ والارشاد کے نام سے انہی مقاصد کیساتھ ایک دار العلم قائم کیا، پھر مصر کی قدیم اور مستند اسلامی درسگاہ جامعہ ازہر کے علماء نے بھی ہوا کا رُخ پہچانا، اور نئی اصلاحات قبول کر کے اسے نئی شاہراہ پر

لائے، اسی طرح مصر میں دوسرے نئے مذہبی مدارس اسکندریہ (زمانہ تعمیر ۱۹۱۳ء) اسیوط (۱۹۱۵ء) زقازیق (۱۹۲۵ء) دسوق و دمیاط وغیرہ تعلیمی مجلس کی نگرانی میں نئے طریق پر تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں،

عراق میں جامعہ آل البیت کی بنیاد دین استوار ہو چکی ہیں کہ دار العلم بغداد میں مدرسہ نظامیہ و مستنصریہ کا منظر پھر سامنے آجائے،

تونس کا جامعہ زیتونیہ محمد بن ابی شنب جیسے صاحب علم کی مدد سے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے،

ترکی میں جدید دور جمہوریت کیساتھ تعلیمی انقلاب بھی برپا ہو چکا ہے، اور اب وہ غیر ممالک کے تعلیمی مرکزوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہے؛

ایران رضا شاہ پہلوی کے سایہ میں تعلیمی ترقیوں میں مصروف ہے، اور اب دانشگاہ ایران سے علوم و فنون کی نئی روشنی پھیل رہی ہے،

ہمارا ہمسایہ ملک افغانستان بھی تعلیم کے لئے کوشش کر رہا ہے، اور کابل یونیورسٹی کی بنیاد پڑ چکی ہے،

---





# اقبال علیہ الرحمۃ کے چند جواہر ریزے جنھیں چننے کا مجھے موقع ملا،

از

جناب پروفیسر خواجہ عبدالحمید صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج ملتان،

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے نومبر ۱۹۲۰ء میں حاصل ہوا، اس سے پہلے میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بیسیوں بار ان کو دور سے دیکھ چکا تھا، اسلامیہ اسکول لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پر ہوتا "آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے" ہر کس و ناکس وہاں موجود ہوتا، آپ بالعموم لے سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے، پہلی نظم جو میں نے ان کی زبان سے بغیر ترنم کے سنی "شکوہ" تھی، اس کے بعد "شمع و شاعر" اور "جواب شکوہ" (جو موچی دروازہ کے باغ میں پڑھی گئی) پھر دوبارہ ترنم "خضر راہ" سے شروع ہوا جو اسلامیہ اسکول دروازہ شیرانوالہ کے صحن میں پڑھی گئی تھی، ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے علیل تھی اس لئے نظم مذکور گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر پڑھی تھی،

اس زمانہ سے پہلے مجھ جیسے شخص کے لئے ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شکل و صورت اور انکا ترنم ہی باعث کشش ہوتا تھا، اسکول اور کالج کے زمانہ میں ہر مسلمان طالب علم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار (اور لاہور میں تو ہر ملت کے طلبہ کو) یاد ہوتے تھے، اور مجلسیں

ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھیں، کالج کے زمانہ میں میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز مشن کالج کے دروازہ سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی گاڑی (ڈگ) میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا، چہرہ سرخ، سنہری مونچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ، غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دور سے ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی (لاہور میں ہم لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" کا لقب، صرف اقبال ہی کے لئے وقف تھا، اس لئے آیندہ سطور میں میں اسی لقب سے یاد کرونگا،

نومبر ۱۹۲۰ئ میں ہندوستان بھر میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی، لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج کی طرف مبذول تھی، مسلمان اور ہندو اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق کانگریسی کارکنوں نے اسلامیہ کالج میں "جماعتوں" کا کام تقریباً ناممکن کر دیا تھا، خود اسلامیہ کالج کی ہستی معرض خطر میں تھی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سکریٹری تھے، چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جنمیں راقم الحروف بھی شامل تھا) فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چلکر ان متضاد فتووں اور قراردادوں کے متعلق، جن کی بارش ہر سمت سے کالج پر ہو رہی تھی، ان کی رائے دریافت کیجائے، ڈاکٹر صاحب اس وقت انارکلی والے مکان میں مقیم تھے اور حسب عادت آرام کرسی پر بیٹھے تھے، حقہ پاس تھا، (میں نے انہیں ان کے قیام گاہ میں حقہ کے بغیر کبھی نہیں دیکھا) ڈیڑھ دو گھنٹوں تک تحریک عدم تعاون کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی، اس سے معلوم ہوا کہ ابھی انھوں نے اس تحریک کی ضرورت اور صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی، گاندھی جی کی انھوں نے بہت تعریف کی، اور جو کام وہ ہندو قوم کی بہتری کے لئے کر رہے تھے، اسے مدنظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر ہندوؤں کی آیندہ



نسلیں انھیں اوتار تسلیم کریں، ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، ظریفانہ انداز میں فرمایا "جسقدر کام کالج میں ہو سکتا ہے، کرتے جاؤ، ہاں ابھی یہ ڈر ہے کہ کالج ٹوٹ نہ جائے اور آپ لوگوں کو تلاش روزگار کی زحمت اٹھانی پڑے، سو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا کاٹ دو، میں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے، اور میری صحت پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا ہے، اس پر قہقہہ پڑا اور ہم لوگ واپس آئے،

اس کے بعد مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا، اور ۱۹۲۴ئ سے ۱۹۲۷ئ تک تو شاید کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی خدمت میں ایک یا دو بار حاضری کا اتفاق نہ ہوا ہو، ان صحبتوں میں طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں، اگر کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تو میں ان سے بعض باتوں اور مسائل کے متعلق سوالات کرتا جن کا وہ کمال مہربانی سے شافی جواب مرحمت فرماتے، میرے ذمہ ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو اچھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گذرے اسے ان کی خدمت میں پیش کروں، اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں، چنانچہ کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق رائے پوچھتے ہوئے اچھا خاصا امتحان لے لیا کرتے تھے،

ڈاکٹر صاحب کی زبان فیض ترجمان سے جو ہزارہا جواہر ریزے بکھرتے رہے ہیں، ان میں سے چند (جو مجھے یاد ہیں اور جن میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لئے بار خاطر ہو) میں نے یہاں جمع کیا ہے، ان میں ان باتوں کو درج نہیں کیا ہے جن میں ملی یا سیاسی معاملات پر تفصیلی بحث تھی، یا جن میں فلسفہ یا سائنس کے دقیق مسائل پر بحث تھی، ایسی باتوں کو بھی ترک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ذاتیات سے ہے، ایسی باتیں بھی نہایت پر لطف اور سبق آموز ہوتی تھیں، لیکن ان کا شائع کرنا مناسب نہیں،

ڈاکٹر صاحب کی یاد ان کے عقیدت مندوں کے دلوں میں ابھی تازہ ہے، وقت گزرتا جائے گا، اور ان کی شخصیت کے خط و خال ذہن میں دھندلے پڑتے جائیں گے، اس وقت ہر اس شخص کے پاس جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا (اور ایسے اشخاص کی تعداد ہزارہا ہے،) ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تبرک ضرور موجود ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان تبرکات کو جمع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو زندگی میں کوئی بوسول (Boswell) نہ ملا، اس لئے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور دوستوں کو ان سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا ہو وہ ان کے جواہر ریزوں کو ضائع ہونے نہ دیں اور جلد تر انھیں دنیا کے سامنے پیش کریں، ڈاکٹر صاحب کے سیرت نگاروں کو اس مواد سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے، "عبد الحمید"

۱۔ ایک روز طہارت کے اسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا، اس سلسلہ میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرض بحث میں آئی، ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے، "میں جب طالب علمی کے سلسلہ میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا، میں جب کبھی رفعِ حاجت کے لئے غسلخانہ جاتا، تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا، چند روز اسی طرح سے گذرے، آخر میری میزبان یعنی مالکۂ مکان (Land lady) سے رہا نہ گیا (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہونگی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھیں) مجھ سے پوچھنے لگیں یہ چیز تم غسلخانے میں کیوں لیجاتے ہو، میں نے ان سے کہا کہ اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے، بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے، چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، میں (یعنی ڈاکٹر صاحب) نے ان کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کئے، مثلاً یہ کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہو جس طرح عورت پر طہر کا غسل، میں نے کہا، بڑی بی، کسی خاص غسل کی تو آپکو اب حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لئے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے، یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ ضرور



ایسا کرونگی، مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں،

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس داں اور اہل طب کو اسلامی قواعدِ طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہئے،

۲۔ "یہود" کا لالچ اور دولت کا عشق ضرب المثل ہے، اس کے متعلق کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہوئی، ایک مرتبہ مثال کے طور پر فرمانے لگے کہ جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ میرے قیام کا انتظام ایسے گھر میں کروا دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو، یورپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں، چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہایش کا انتظام کروا دیا گیا، ان لوگوں میں بہت خوبیاں تھیں، اپنی "نماز" باقاعدہ پڑھتے تھے جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا، میں نے ان سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ میرے لئے بھی پیغمبر ہیں، اور میں ان کی روش پر چل سکتا ہوں، وغیرہ، لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا، مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جسکو میں ان کے ذریعہ سے منگواتا تھا یہ لوگ دوکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے، ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا،

۳۔ ہندوستانی مذاہب پر ایک روز مجھ سے باتیں کر رہے تھے، بدھ مت کا ذکر آگیا، فرمانے لگے انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا، یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی، اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا، گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا (all change) یعنی "سب بدل جاؤ"، ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا، کہ میرے ارد گرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے، ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں،

ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہئے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، یہ کہہ کر چپ رہا، چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں، میں نے کہا ہاں، اس دوران میں اسٹیشن آگیا، اور گارڈ all Change پکارنے لگا، میں نے کہا بس یہی بدھ مذہب ہے، all change (یعنی مسئلہ تناسخ)

۴۔ کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیانِ مذہب دنیا میں آئے، وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پیترا جما لیا، اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے، وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ انھوں نے جواب دیا، یہ تمہارے میکا یولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں، اس پر بہت قہقہہ پڑا،

۵۔ یورپ اور انگلستان میں اس وقت بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے خیال میں ہندوستان میں صرف بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جنگل، بیابان، چند بڑے بڑے شہر، شیر، سانپ، بچھو، سپیرے اور جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں، یہ خیال بہت کچھ یورپین پادریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی جدت طبع کا مرہون منت ہے، اسی طرح سے یہ لوگ اپنی بہادری اپنے ہم عصروں پر جتا سکتے ہیں اور گپیں ہانک کر مجلسوں کو گرما سکتے ہیں، چنانچہ طلب علمی کے سلسلہ میں جب اقبال انگلستان گئے (یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا) تو انہیں بھی اس طرز خیال کا تجربہ ہوا، ایک مجلس میں ایک لیڈی صاحبہ پوچھنے لگیں، کیوں مسٹر اقبال! کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدگی سے بولے، نہیں بی جان، ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن،



۶۔ ایک مرتبہ ایشیا اور یورپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا، میں نے پوچھا کیا ایشیا اور یورپ کی عورتوں میں بھی وہی فرق ہے جو ان ممالک کے مردوں کے درمیان ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں میں نے انگریز اور جرمن عورتوں کے باہمی امتیاز اور فرق کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا، (انگریز اور جرمن عورتوں کی تخصیص اس لئے کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب طلب علم کے زمانے میں زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں میں رہے تھے) فرمایا "انگریز عورت میں وہ "نسائیت" اور "بے ساختگی" نہیں جو جرمن عورت میں ہے، جرمن عورت ایشیائی عورت سے ملتی جلتی ہے، اس میں محبت کی گرمی ہے، انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں، انگریز عورت گھر، بندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے" میں نے عرض کیا آپ کے اس خیال کی تصدیق مسٹر ڈبلیو، ٹی، سٹیڈ (W. T. Stead) (جو انگلستان کے مشہور سیاست دان تھے، اور کسی زمانہ میں انگریزی رسالہ ریویو آف ریویوز کے مدیر بھی تھے) کے ایک قول سے ہوتی ہے، جو اس وقت مجھے یاد ہے، ایک موقع پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ جرمن عورتیں بہ حقیقت پردہ میں ہیں، (یہ قول زمانہ قبل از جنگ کا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اب بھی صحیح ہو) انگریز اور امریکن عورتوں کی آزادی کے مقابلہ میں جرمن عورتیں تقریباً پردہ ہی میں ہیں،

۷۔ طلب علم کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے، تو سر سید علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا اسم مبارک مولوی ... صاحب تھا (غالباً آپ ایڈوکیٹ تھے) سیاحت کے سلسلہ میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہنچے، (ان بزرگ کو میں نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے وفد میں لاہور میں دیکھا تھا، میں ان دنوں اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا، اس وقت مولوی صاحب شکل و ہیئت میں بالکل سر سید کا ثنی تھے، وہی لمبی ترکی ٹوپی، لمبی سفید داڑھی، سیاہ مارننگ ڈریس، الغرض چھوٹے پیمانے پر سر سید معلوم ہوتے تھے) پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ جنھیں اقبال سے شغف تھا اور جن کی توجہ سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی مستفید ہوئے تھے، ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے، اور اقبال کے مربی خاص تھے، بلکہ جب

پروفیسر موصوف چند ماہ کے لئے مصر تشریف لے گئے تو اقبال ہی کو وہ اپنا جانشین بنا کر گئے تھے،

مولوی صاحب لندن میں تشریف لائے چونکہ پروفیسر آرنلڈ سرسید مرحوم کے حلقۂ اثر بلکہ خود علی گڈھ کالج میں رہ چکے تھے، اس لئے مولوی صاحب ان ہی کے پاس گئے، انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھئی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں اور چیزیں دکھا دو۔ . . . اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا، اور شام کے قریب کسی قہوہ خانہ میں جا بٹھایا، وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں، اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانیٔ طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہو گئیں، کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی، کوئی ان کی نورانی داڑھی پر شیدا تھی، ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت مندی کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں اس مصیبت سے جب ان کو نجات ملی تو وہ غصہ سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی، دوسرے روز جب اقبال، پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بہت خفا تھے، فرمانے لگے، "اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہو گئے ہو، تمھیں شرم نہ آئی، مولوی صاحب ایسے بزرگ کو اس قہوہ خانے میں لے گئے، اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا، قبلہ "آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابلِ دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھا دوں، اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات، تاریخی عمارتیں، وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے، اور ہندوستان جاتے ہوئے، لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے، لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رخ خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے، اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں، میں انھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا، اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے، ان کے اسلامی فلسفہ کا ایک اہم رکن تھا، اسی خیال سے مجبور ہو کر انھوں نے سوامی۔ جی کے سوانح نگاروں کو ٹوکا تھا، دیکھئے نیچے نمبر ۸)



۷۔ جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پرانے زمانے سے فلسفہ اور مذاہب میں ہو چکی ہے، اس کے برے نتائج میں سے سب سے برا نتیجہ یہ ہے کہ عام مذاہب میں جسم اور اس کی خواہشات کو برا کہا گیا ہے لیکن اسلام میں نہ "جسم" کو کبھی برا کہا گیا اور نہ جسمانی لذات کو کوسا گیا ہے، صرف اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں، جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذات حاصل کرے، اس سے مواخذہ نہیں، اور نہ وہ گنہگار ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے لئے قربان نہ کرے، دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذاتِ جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں، کہ خود "جسم" کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح سے "جسم" کو ایذا دی جائے اور جسمانی لذات کے حصول کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے، ادھر "جسم" میں خودی ہے جس قدر اس کو ٹھکراؤ بگڑتا ہے، دباؤ ابھرتا ہے، لذات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس اسلامی تعلیم کو بار بار اور نئے نئے رنگ میں اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے،

قریباً بارہ یا سترہ سال ہوئے، میں ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں یہی مسئلہ معرضِ بحث میں آگیا، فرمانے لگے، ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مجھے اس اسلامی تعلیم کی صحت کا ثبوت ضمناً ذکر کرنا پڑا، دو تین ہندو صاحبان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے رشیؔ سوامی جی کی سیرت لکھی ہے، آپ چونکہ سوامی جی کے گہرے دوست تھے، اس لئے آپ اس سیرت پر نظرِ ثانی فرمائیں اور ہمیں مزید مواد دیں، بلکہ خود بھی کچھ لکھیں وغیرہ، "ڈاکٹر صاحب نے کہا" جو سیرت آپ نے لکھی ہے، دکھائیے، "ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا، یہ سیرت بالکل اسی طرح سے لکھی گئی تھی جیسے اس نوع کی کتابیں بالعموم لکھی جاتی ہیں، یعنی ممدوح کو فرشتہ سیرت، ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرا اور منزہ ثابت کرنا، ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا، آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، اور نہ اس درسِ عبرت کا جو ان کی زندگی

سے حاصل ہو سکتا ہے، اس کتاب میں ذکر ہے، انھوں نے پوچھا وہ کیا، فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ فلاں سال سوامی جی اپنی تعلیم ہمہ اوست، اور "برھمچاریہ" کے پرچار کے لئے امریکہ تشریف لے گئے تھے اور بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، ان کے حلقۂ اثر میں آگئے، ان میں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی، لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے، یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے، کہ وہ خود "برھمچارہ" کو نباہ نہ سکے اور اپنے اس فعل سے انھوں نے اپنی تعلیم کو غلط ثابت کر دکھایا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس غلط تعلیم اور غلط اصول کو چھوڑتے، انھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا، اور اس وجہ سے انھوں نے بچہ اور اس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا، آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کی زندگی کے اس اہم واقعہ کو کھول کر بیان کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی کس حد تک کامیاب رہے: ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ان دوستوں کو کیوں بھاتی، کہنے لگے، جناب والا ان باتوں کو کتابوں اور سیرتوں میں لکھنا نہیں چاہئے، یہ کہہ کر واپس چلے گئے،

مین نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ سوامی جی سے آپ کی دوستی کس زمانہ میں تھی، فرمایا کہ لاہور میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں میری ان سے دوستی بڑھ گئی تھی، میں نے انھیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا، بلکہ پڑھائی بھی تھی، سوامی جی سے میں نے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی، ڈاکٹر صاحب سوامی جی کے خلوص نیت اور روحانی سرشاری کے بہت معترف تھے، اور اسی لئے وہ سوامی جی کے برھمچار کی ناکامی میں ان کی حیات کا اہم ترین سبق پاتے تھے، یعنی جو بات سوامی جی سے بھی نبھ نہ سکی وہ ہے غلط،

۹- چند سال ہوئے ایک جرمن یا آسٹرین سیاح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا، آپ اس زمانہ مین میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے، سیاح صاحب "جہاں گرد" (GLOBETROTTER) تھے، علی بخش



(ڈاکٹر صاحب کا ملازم) نے اسے پہلے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پٹھانستان کا کوئی فقیر ہے، اسے اندر بلوایا گیا، ادھر ادھر کی باتین ہوتی رہیں، اس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی بیاض دکھائی جس میں ہر ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا، سیاح مذکور نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھدیں، انھون نے فارسی کا ایک قطعہ لکھکر دستخط کر دیئے، اس نے پوچھا آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا میرے آبا و اجداد برہمن تھے، انھوں نے اپنی عمرین اس سوچ میں گذار دین کہ خدا کیا ہے، مین اپنی عمر اسی سوچ میں گذار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے،

۱۰- ۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے مین بیٹھے تھے، (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے، یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت مین وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے"، انھوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے، جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہونگے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمھیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعر بازی" کی ضرورت نہیں؛ اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعر بازی کی طرف اسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں "بقا" کا عنصر موجود ہو، آپ نوجوان ہیں آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہئے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو محنت اور مطالعہ کے بعد اردو زبان میں مختلف

موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر
صاحب کی تقریر کا کم وبیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوانوں شعرا کے جوش کو ٹھنڈا
کیا، اور وہ یہ لکچر سن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے،

۱۱- ۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، ان کی لیاقت، وسعت علم اور
بالخصوص فصاحت و بلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں، فن تقریر میں بہت
کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان، محاورہ، تلفظ اور ادب میں تو انھیں بلا کی دسترس
حاصل تھی، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ ابھی نئے نئے وارد
ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فن تقریر میں ان کا پایہ مسلّم ہے، لیکن یاد رکھو کہ (انبیاؑ اور
مصلحین اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان میں روحانیت
کا فقدان ہوتا ہے In people other than prophets and gre
at national reformers, too much of public
speaking in very often
"باتونی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس تو یہ ہے a sign of spiritu
al poverty
کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ انگلستان میں
طالب علمی کے زمانہ میں، میں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا، لیکن بعد میں
میں نے اسے بالکل ترک کر دیا، علامہ نے جو کلیہ اوپر بیان فرمایا ہے، اس میں "بے ضرورت" TOO MUCH
یا "ضرورت سے زیادہ" پر زور ہے، عوام اور سامعین سے خراج تحسین حاصل کرنے میں مقرر صاحب کو
وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث، پر پورا عبور رکھے بغیر دھواں دھار تقریر فرما دیتے ہیں،
اس لئے ایسے بزرگوں کے اقوال و تقریروں میں سطحیت کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے، بہت کم مقرر
ایسے ہوتے ہیں جو کاوش اور مطالعہ سے اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھتے ہیں، ان سطحی مقررین



کے برعکس جو شخص کچھ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ اپنے الفاظ پر غور کرتا ہے، اور جب تک اسے
اپنی بات اور اپنے استدلال پر پورا یقین نہیں ہوتا، وہ انھیں عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا ہے،
اس حقیقت کو البتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے دلوں کی تسخیر کے لئے جو طاقت اور جذب تقریر میں
ہو سکتا ہے وہ تحریر میں ممکن نہیں،

انبیاؑ اور مصلحین اقوام ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں، وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے
الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت و الہام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ شوق تقریر سے
مجبور ہو کر نہیں بولتے بلکہ صرف اس لئے بولتے ہیں کہ بغیر تقریر کے چارہ نہیں، ان کی تقریر سراسر روحانیت
ہوتی ہے، کیونکہ خود خدا ان کا سکھانے والا ہوتا ہے، علّمہ البیان، (باقی)

# آخری سلاطینِ مغلیہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے رفیق دار المصنفین

(۲)

## بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے، وہ بادشاہ بنا مگر حکمرانی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت و عظمت کی یاد میں خون کے آنسو بہانے کے لئے، سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی، سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا، وہ پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا، لیکن اسکی ساری بادشاہی قلعہ معلّیٰ کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں وہ نہ امورِ سلطنت کے لئے فرامین صادر کرتا، اور نہ اعیانِ حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے توڑتا، اور جب وہ پھوٹ کر بہ جاتے، تو اس کے سوز و گداز کا اظہار اپنے نالہاے موزوں سے کیا کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسکی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے، وہ اور شعراء کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے:-

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا نالۂ زار — کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج و تخت کا نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ تھا، جہاں اس نے اپنی طبیعت کی ذہانت و ذکاوت اور بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ انہی اوصاف کو سیاسی کام میں لاتا



تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاست داں بھی ثابت ہوتا، لیکن نہ اب رزم کی معرکہ آرائیاں تھیں، اور نہ بزم کی نکتہ آفرینیاں، لامحالہ ایک بے چین اور بے قرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہوگئیں، اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا،

ظفر کا دور ہندوستانی شاعری کا دورِ شباب تھا، نصیر، ذوق، ممنون، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کی شاعری نے ریختہ گوئی کی زمین کو آسمان پر پہونچا دیا تھا، ان ہی اساتذہ کیساتھ ظفر نے بھی طبع آزمائی کی، اور نمایاں حیثیت حاصل کی، نصیر نے ریختہ گوئی میں مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی، ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات سے آراستہ کیا، مومن اپنی نازک خیالی اور شوخی ادا کیلئے ممتاز رہے، غالب کے طرزِ بیان، مسائلِ تصوف، اور نکاتِ فلسفہ نے شاعری کو عرشِ معلّیٰ پر پہونچا دیا، مگر اس گروہ میں ظفر کی شاعری میں جو سلاست صفائی اور روزمرہ کی سادگی پائی جاتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے،

طرزِ سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے، — اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

ظفر کلام میں تیرے عجب صفائی ہے، — کہ ہر سخن ترا دُرِّ خوش آب سا چمکا

خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو — ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحر المعانی ہے،

ظفر شاعری سے مناسبتِ ازلی رکھتا تھا، ایامِ شاہزادگی سے زندگی کے اخیر دنوں تک شعر و سخن کی مشق کرتا رہا، ولی عہدی کے دنوں میں دلی کے تمام باکمال شعراء[1] اس کے درِ دولت پر حاضر ہوتے، اور وہ اپنا کلام سناتا، اور اُن سے ان کے نتائجِ فکر سنتا، سریر آراے حکومت ہوا تو قلعہ معلّیٰ

[1] مثلاً حکیم ثناء اللہ فراق، حافظ عبدالرحمٰن خان احسان، حکیم قدرت اللہ خان قاسم، میر قمر الدین منت، نظام الدین ممنون،

کے اندر بزم مشاعرہ منعقد کراتا، کبھی کبھی شہر میں جا کر مشاعروں میں شریک ہوتا، اپنی غزلیں پڑھتا، دوسروں کی سنتا، داد لیتا اور داد دیتا تھا، یہانتک کہ اساتذۂ فن میں شمار کیا جانے لگا، چنانچہ تمام ارباب نظر نے اسکی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کی دل کھول کر داد دی ہے[1]

ظفر شاعری میں پہلے تو نصیر، پھر بے قرار، پھر ذوق، اور آخر میں غالب کا شاگرد ہوا، مگر اسکی ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی ایک کی بھی خالصتہً تقلید و پیروی نہیں کی، طبیعت میں خاکساری تھی، اس لئے اساتذۂ فن کی شاگردی قبول کر لیتا تھا، مگر اساتذہ اپنے لائق شاگرد کو اپنے خیالات اور جذبات سے متاثر نہ کر سکے، وہ شاید صرف فن کے اغلاط اور اسقام کو درست کر دیتے تھے، ورنہ اگر ظفر اپنی راہ چھوڑ کر اپنے استادوں کی راہ پر گامزن ہوتا، تو اس کے سارے کلام میں اول تو نصیر کی مضمون آفرینی اور شکوہِ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے، یا پھر ذوق کی طرح عام زبان کی کہاوتیں اور عام لوگوں کے اوہام و مزعومات کی کثرت ہوتی، یا آخر میں

[1] نواب مصطفٰے خان شیفتہ جو ظفر کے ہمعصر تھے، اور اسکی صحبت میں شریک بھی ہوتے تھے، لکھتے ہیں:

"بہ اکثر صفات موصوف و محامد مکارم معروف، در اکثر خطوط دستگاہے شایستہ دارد... باین فن (یعنی شاعری) بسیار مالوف است، شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نعمتش زلہ ربا و وظیفہ خوار است وافکار ایشان بمحک اصلاح آوردہ است دہموار"

منشی احمد حسین سحر تذکرۂ بہار بے خزاں (۱۲۹۱ھ) میں ظفر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ظفر تخلص، مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی بفن شعر میلے و مناسبتے تمام دارد، ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست، و افکار ایشان باصلاح او چوں گوہر آبدارند"

تذکرۂ بزم سخن میں ظفر کے بارے میں ہے:-

"در سخن پایہ ارجمند داشت گفتارش اگرچہ سادہ پرکار است ہمہ اش خاطر شکار است



غالب کے فلسفہ اور تصوف کی نکتہ آرائیاں اور فارسی کی پرشوکت ترکیبیں ہوتیں، مگر ان میں سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری اس کے کلام میں نہیں، وہ اپنے ہی رنگ اور طرز ادا کا مالک رہا، بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا، پھر زندگی کچھ ایسی گذری کہ شاعر نہ بھی ہوتا، تو انقلابات زمانہ اور حوادث روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہو جاتا، اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی، عزت و وقار کا خاتمہ ہوا، غدر ہوا تو نان شبینہ کو محتاج ہو گیا، دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرا، لخت ہائے جگر کو خون میں تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس و مقید ہو کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی، شاعر بننے کے لئے اور کیا چاہیئے تھا، اور شعراء نے بلبل کے نالۂ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا، ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی، اور شعراء نے عاشقانِ زبون حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں

(حاشیہ) محاورہ گوئی از آن اوست و معاملہ نویسی زیر فرمان او"

منشی کریم الدین صاحب رقمطراز ہیں:-

"شعرا ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا، ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا، کہ تخت نشین ہوئے، ابتدا میں ولی عہد تھے، ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے، تمام ہندوستان میں اکثر قوال.... ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں، ہر ایک قسم کے شعر ہیں"

ظفر کی بابت مولوی امام بخش صہبائی کی دلچسپ عبارت ملاحظہ ہو:-

"گوہر سخن اس کے لب سے ہم پایہ اعجاز اور مضمون نیاز اس کے اشعار میں ہم پہلوے ناز شاہدان محفل قدس ہر راہ سے اس کے جادۂ قلم میں عنان افگن ہیں، اور نازنینان ملک تقدس ہر طرف سے اسی کے میدان صفحہ میں گامزن ہیں، اس کے قلم کی صریر ہے یا

کھینچکر عبرت کا پیام دیا، ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستان رہی، اسلئے اسکی ہر صدا صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آواز بازگشت ہوگئی، اور شعرا نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا رونا رویا، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستان کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے خیالات میں محشرستان پیدا نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا، ؟ اپنی شاعری میں خونِ جگر خوب خوب بہایا، اُسکی تمام شاعری مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہوسکتی ہے، یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری حکومت کا آخری فرمانروا ایسا ہو، جو صحیح طور پر اُسکے کمال کے زوال کا خونچکاں ماتم کرسکے،

یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری حزن و ملال، رنج و الم اور یاس و حسرت کی سراپا داستان ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) خوشخرامانِ معنی کی آواز پا اوس کے الفاظ سے فروغِ معنی جلوہ گر ہے، یا مینا سے پری نقاب کشا...... اشعار متصوفانہ میں دیدۂ مینا اور ابیات عاشقانہ میں چشم گریہ زا اور بین السطور بہاریہ میں خیابان اور فلکیات میں کہکشان نقش شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن اور نگاہ تازگی رقم سے ریشۂ یاسمن مصرع قامت شمشاد و بیت ابروئے خوبان خلخ و نوشاد"

عبدالغفور نساخ اپنے سخن شعرا (۱۲۹۱ھ) میں لکھتے ہیں:-

"اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے، شعر نہایت شیریں و نمکین کہتے تھے"

موجودہ دور کے ادبا میں خواجہ الطاف حسین حالی تحریر فرماتے ہیں کہ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے،

محمد حسین آزاد نے باوجودیکہ اپنے استاد کی محبت، اور عصبیت میں ظفر کے تمام کلام کو ذوق کی طرف منسوب کردیا ہے، پھر بھی وہ اس کو شعر و شاعری میں طبیعت اور ایجاد کا بادشاہ بتاتے ہیں،



دیوان میں بعض غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں رنگینیوں اور سرمستیوں کی جھلک ہے، بعض تو متانت اور سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہیں، مگر یہ شاید غایت رنج و مصیبت اور شدتِ غم و الم کا ردعمل ہے، ظفر کی اندوہناک زندگی میں کوئی ایسی صورت باقی نہیں رہی تھی، کہ دو چار گھنٹے بیٹھ کر غم غلط کرلیتا، گذشتہ روایات کے مطابق شکار کی تفریحیں اور نہ عیش و نشاط کی محفلیں تھیں، اور نہ قلعہ معلی کے اندر مسرت و شادمانی کی مجلسیں تھیں، لامحالہ شدتِ غم سے چھٹکارا پانے کے لئے ظفر شاعری ہی میں رند بلانوش اور غافل از تمکین و ہوش ہوجاتا، ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ مصیبت و نکبت کی وجہ سے فقر و درویشی نے مزاج پر ایسا استیلا پالیا تھا، کہ وہ نہ صرف برابر اذکار و وظائف میں مشغول رہتا، بلکہ آل تیمور کی لفظی و سیاسی پیری و مریدی ظفر کے ہاں حقیقت بن گئی تھی جس کا ذکر آیندہ صفحات میں ملے گا،

ظفر کا دیوان نولکشور پریس لکھنؤ سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے جس میں ہر قسم کے تین ہزار سے زیادہ اشعار، مثلاً حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مثلث، مخمس، مستزاد، قطعات، رباعیات، نکھیا اور سہرا ہیں، بھاکا، پنجابی اور فارسی کے بھی اشعار ملیں گے، جن سے ظفر کی طباعی اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، اس مجموعہ میں وہ حصہ شامل نہیں جو ظفر نے غدر کے بعد کہا، اس زمانہ کا کلام شائع نہ ہوسکا، بلکہ ضائع ہوگیا، حالانکہ اس عہد کی شاعری میں نہ صرف پختگی بلکہ جذبات میں اور بھی درد اور شدت پیدا ہوگئی ہوگی،

**کلام ظفر** دیوان، حمد کے بجائے ایک نعتیہ قصیدہ سے شروع ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اے سرور دو کون شہنشاہ ذوالکرم — سرخیل مرسلین و شفاعت گر امم

موکب ترا ملائک و مرکب ترا براق — مولد ہے تیرا مکہ و معبد ترا حرم

رنگ ظہور سے ترے گلشن رخ حدوث — نور وجود سے ترے روشن دل قدم

ہوتا کبھی نہ قالب آدم میں نفخ روح — بھرتا اگر خدا نہ محبت کا تیری دم

کرتا تھا جس سے مردہ کو زندہ دم مسیح — تھا شمہ تیرے خلق کا وہ اے علو شیم

ٹوٹا جو کفر قوت اسلام سے تری — صد جائے سے شکستہ ہوا نار موج یم

تو تھا سریر اوج رسالت پر جلوہ گر — آدم نہاں ہنوز پس پردۂ عدم

کرتا ہے تیرے اسم مبارک کو دل پہ نقش — اس واسطے عزیز جہاں ہو گیا درم

اے معدن کرم تری ہمت کے روبرو — کم تر ہے سنگ ریزہ سے قدر نگین جسم

جو کچھ سوائے عرش و سب اسکے سایہ میں — تیرے ہوا ہے جاہ کا برپا جہاں علم

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں — رکھتا سر زمین نہ اگر اپنا تو قدم

محروم تیرے دست مبارک سے رہ گیا — کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

عالم کو تیرا نور ہوا باعث ظہور — آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم

ہیں زائران روضۂ اقدس تری جہان — آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم

واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا — والشمس ہے ترے رخ پر نور کی قسم

انصاف تیرا دیوے جو داد ستم کشاں — دندان سین آرہ کشاں ہو سر ستم

قرآں میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا — کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم

تیری جناب پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض — صدقے میں اپنی آل کے اے شاہ محتشم

صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر — آئینۂ ضمیر سے میرے غبار غم

ہو بچانہ آستان مقدس کو تیرے میں — اس غم سے مثل چشمہ ہوئی میری چشم نم

پر خاک آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ میل تصور سے دم بدم

اہل نظر جانتے ہیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل ہے، بقول عرفی، ع رہ بردم تیغ است قدم را



لیکن ظفر کے ہم عصر شعرا میں اتنا موثر نعتیہ قصیدہ کسی نے نہیں کہا، وہ کچھ اور نہ بھی کہتا تو صرف یہی قصیدہ اسکے اعجاز شاعری کیلئے دلیل و برہان تھا، دیوان کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ حمد سے شروع ہوتا ہے جس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

شاباش ولا اشریک لک اللہ تعالیٰ — پہچانا اسے تو نے جسے دیکھا نہ بھالا

اللہ ری تری ہیبت قہر گان ستم کیش — اک پل میں کئے تو نے دو عالم تہ و بالا

ادا پورا نہ ہو یک حرف اصلا حمد یزداں کا — اگرچہ صد زباں ہو دو زباں خامۂ سخنداں کا

اگر ہو جائے پارہ پارہ دل اسکی محبت میں — تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سی پارہ قرآں کا

جسے خیال ہے کچھ رحمت الٰہی کا، — گناہ سمجھے ہے دعوی وہ بیگناہی کا

یہ لطف دیکھ کہ خود بے نیاز ہے لیکن — دھیان ہے اُسے بندوں کی خیرخواہی کا

تم اپنے جی میں عزیز اور ذلیل ٹھہرالو — خدا ہے ایک وہ ہر مرغ و ماہی کا

ظفر کو اپنے حمد و نعت پر بہت زیادہ فخر تھا، چنانچہ کہتا ہے،

ظفر مضمون حمد و نعت کے لکھا ہوں رنگیں سو — ورق میرے سر دیواں کا ہوا اک باغ رضواں کا

### ظفر کی المیہ شاعری

اوپر کی سطروں میں کہا گیا ہے کہ ظفر کی تمام شاعری الم و یاس اور اندوہ و غم سے بھری ہوئی ہے بعض غزلیں تو پوری کی پوری المناک جذبات سے لبریز ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی مٹی ہوئی شوکت اور گذری ہوئی حشمت پر بے اختیار ہو کر روتا ہے اور آنسو بہا بہا کر کہتا ہے:۔

بلا سے گرچہ ہوتا راز دل افشا ہو رونے میں — نہ روکو مجھکو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں

پڑا ہے کشتی افلاک کا رونا زمانے میں — مری آنکھوں نے وہ طوفاں کیا برپا ہے رونے میں

ری دیوانگی کا اے پری رو ہے عجب عالم — کبھی رونے میں ہنستا ہوں کبھی ہنستا ہوں رونے میں

سُنا ہے نوح کے طوفاں کو یاروں نے کانوں سے
مگر آنکھوں سے اپنی ہم نے وہ دیکھا ہے رونے میں

لگے اگ ایسے رونے کو کہ مثلِ شمع گھل گھل کر
بہا جاتا مرا دل سوز سرتاپا ہے رونے میں

ظفرؔ ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے
رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

پھر بھی روتا جاتا ہے، اور اس رونے میں اتنی شدت ہے کہ اسکو خود احساس ہے، کہ

لگ جائے جھڑی برسوں پھر آنسو نہ تھمیں
جھاڑوں جو دمِ گریہ میں دامنِ مژگاں کو

اور جب رو کر چپ ہوتا ہے، تو اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے آہ سوزاں بلند کرتا ہے،

شعلہ جو سوزِ دل سے گلوگیرِ آہ ہو
پیکاں نمط عیاں وہ سرِ تیرِ آہ ہو

سیلِ سرشکِ دیدۂ چشم بھی ہمراہ ہو اگر
جوں سروِ آب جو بیان توقیرِ آہ ہو

دکھلائے جو سوزشِ دل کو تو برق بھی
حیران دیکھ عالمِ تنویرِ آہ ہو

کلک جلی تو شمعِ جگر سے بنا
مانی جو کھینچے تو مری تصویرِ آہ ہو

نالاں ہیں ایک عمر سے ہم اسلئے ظفرؔ
کب اسکے دل میں دیکھئے تاثیرِ آہ ہو

اور جب آہ کھینچنے سے بھی اس کو تشفی نہیں ہوتی، تو چیخیں مارتا ہے، اسطرح جیسے کوئی نشترِ غم اس کے تمام جسم میں چبھو رہا ہو،

کیا رنگ دکھاتی ہے چشم ترا ہو ہو
خونِ جگر آہا لختِ جگرا ہو ہو،

اس ہستی یک دم پر اف بل بے تری گرمی
ہنستا ہے شرارت سے کیا کیا شررا ہو ہو،

اک وار میں دو ٹکڑے کرتی ہے مرے دل کے
کیا تیز ہے قاتل کی تیغ نظرا ہو ہو،

چھڑکے ہے نمک قاتل لے لیکے نمکداں سے
لیتے ہیں مزے کیا کیا زخمِ جگرا ہو ہو،

ہستی کی عدم سے مر مر کے پہونچے ہیں
اک دم کی مسافت پر اتنا سفرا ہو ہو



اس پر بھی اسکو تسکین نہیں ہوتی ہے، تو اپنی حالت اس طرح بیان کرتا ہے، کہ

سینہ میں اک دھواں کئی بار اٹھکے رہ گیا
نکلا نہ میرے دل کا بخار اٹھکے رہ گیا

آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے
سو بار دیکھا ابرِ بہار اوٹھکے رہ گیا

دیتا جلا فلک کو مگر خیر ہو گئی
ساتھ آہ کے جو دل سے شرار اٹھکے رہ گیا

آتشِ غم سے اس کا دل جل کر داغدار ہو گیا تھا، وہ بھی ایسا کہ خود کہتا ہے،

ذرہ جو دکھاتا ہوں داغِ دلِ سوزاں کو
چڑھتی ہے تپ لرزہ خورشیدِ درخشاں کو

وہ اپنی مصیبتوں اور صعوبتوں سے گھبرا جاتا ہے، اور ظالم چرخ سے شکایت کرتا ہے کہ

سدا گردش میں ہم ہوں اور نہ اک دم ور ساغر ہو
یہ کیا انصاف ہے اے چرخِ گرداں یہ ہو وہ ہو

مگر پھر اپنے کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے، کہ

ہو زیرِ فلک راحت کس طرح ظفرؔ ہم کو
آرام نہیں آپ ہی اس گنبدِ گرداں کو

یہ تو ظفرؔ کی وارداتِ زندگی کا نالہ و شیون تھا، جن کے تاثرات کی گہرائی کو ظفرؔ نے خود بیان کیا ہے کہ،

ہمسر ہوں میرے نالہ سے کیا نالہائے نے
اس میں ظفرؔ یہ سوز کہاں اور کہاں گداز

اب یہی سوز و گداز اس کی شاعری کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے، جب وہ ایک شاعر بن کر عشق کی تمام واردات یعنی محبوب کی کج ادائیاں، ستم آرائیاں اور بے اعتنائیاں بیان کرتا ہے تو طالبِ محبوب کی محویت، شیفتگی اور ہجوم آرزو میں صرف سوز و گداز ہی کی نیرنگیاں دیکھنا چاہتا ہے، اسکا معشوق عام معشوقوں کی طرح ظالم پُر فریب، حیلہ ساز اور دل آزار ضرور ہے لیکن اس کے عاشق کے عشق میں ہوسناکی نہیں وارفتگی ہے، وصال کی لطف اندوزی نہیں، ہجر کی غم انگیزی ہے، اور حسن کی رسوائی نہیں بلکہ عشق کی پسپائی ہے،

اس کا عاشق عشق کے میدان میں اس طرح آتا ہی، کہ

جو آگے عشق کے میدان میں بڑھائے پاؤں
تو شرط یہ ہی کہ پیچھے نہ پھر اٹھائے پاؤں

اور جب وہ سر بکف ہو کر اس میدان میں آجاتا ہی، تو پھر وہ ہے اور ہر قسم کی مصیبتوں کی بلاکت خیزی، وہ ہی اور عشق کی آتش افروزی،

ہوتی ہی بری عشق کی آتش ہی ڈر ہی
گھر پھونک نہ دے آتشِ سوزاں کسی کا

خانۂ دل کو لگی ہی آگ سوزِ عشق سے
ہر بُنِ مو سے نکلتے ہیں شرارے بے طرح

مگر بایں ہمہ وہ عاشق سے ضبط، تحمل، سرفروشی، بلکہ صرف تڑپ چاہتا ہے، اور وہ بھی ایسی

کہ جل کے خاک ہو دل اور خبر کسی کو نہ ہو،

وہ تو عشق میں رونے کا بھی قائل نہیں،

رو رو کے میرا رازِ نہاں فاش کر دیا
خانہ خراب ہو جیو چشمِ پُر آب کا،

لیکن جب ہجر میں بے تاب ہو کر روتا ہے، تو پھر یوں کہ

نہیں اے ابر ہم قائل کہ آنسو سر بسر ٹپکے
وہ کیا آنسو ہی جب بے آمیزشِ خونِ جگر ٹپکے

ہر اک آنسو کا قطرہ ہی جو دانا کہربا کا سا
دمِ گریہ جگر کے آبلے کیا پھوٹ کر ٹپکے

گو حقیقت میں وہ چشمِ گریاں کا نہیں، بلکہ دلِ بریاں کا قائل ہے، دل جل جائے مگر شرط یہ ہی کہ خاکستر نہ ہونے پائے بلکہ اس میں صرف سوزش ہو اور اس طرح کہ

دکھلائیں سوزشِ دلِ بیتاب ہم اگر
کانپ اٹھے شعلۂ شوق سے نارِ جحیم کا

اور اس سوزش میں اتنی ٹیس ہو کہ

دونوں گدازِ عشق سے بہ جائیں ہو کے آب
آہن جو دل کے پاس ہو پتھر جگر کے پاس

اور پھر اس کے دل میں کچھ باقی نہ رہ جائے،



دل میں تو کچھ نہیں ہی دم و دود لے ظفر
اک آہ رہ گئی ہے، فقط اک جگر کے پاس

ظفر کے عشق کا فلسفہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا عشق تو اس کا مقتضی ہی کہ عاشق اس سوزش سے مضطرب، بے قرار اور بے چین ہونے کے بجائے لطف اندوز ہو، عشق کی آگ سے دل پر داغ پڑ جائیں، مگر:-

خانۂ دل میں رہے روشنیٔ داغِ عشق،
بجھنے نہ پائے مرا یہ کبھی یارب چراغ

اور گو جگر میں زخم پڑ جائیں لیکن:-

پھاہا نہ زخمِ دل سے اٹھا میرے چارہ گر
رہنے دے اس کو تو خم پر جوش ہی ڈھکا

کیونکہ

سب پہ کھل جائیگا میرے دلِ مجروح کا حال
دل کے زخموں سے ذرا بھی جو یہ سرکے پھاہے

ظفر کے یہاں ایک کامیاب عشق کے مدارج یہاں پر بھی ختم نہیں ہونے پاتے، اصلی سوزِ عشق تو یہ ہے، کہ

دفن ہو دیگا ترا کوئی جہان سوختہ جان
سبزہ واں خاک ہی پیدا کبھی ہوئیگا نہین

بلکہ

اف ترے کشتہ کا سوزِ دل کہ ظالم سنگ بھی
گور پر اس کے رہا محشر تلک جلتا ہوا

اور

رفاقت کیا کہوں آہ جگر اور داغ سوزاں کی
ہماری قبر پر حاجت نہیں ہی شمع گریاں کی

(باقی)

# دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

## کا

## سالانہ اجلاس

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ہمارے ملک کا سب سے پرانا ادارہ ہے، جس کا مقصد عربی زبان کی قدیم نادر کتابون کو چھاپ کر عام کرنا ہے، نواب عماد الملک بہادر مرحوم اور اُن کے چند ساتھیون کی کوششون سے آج سے نصف صدی پہلے اس کا قیام ہوا، اور اس وقت سے آج تک اوس کی زندگی کا ہر قدم آگے ہے،

دائرہ نے اپنی زندگی کے چند سالون مین حدیث، رجال، فلسفہ، تاریخ، طبقات، طب، وغیرہ کے ایسے انمول موتی ہمارے دامن میں دھر دیے ہیں، کہ اس مفلسی کے ایام میں ہم کو بھی تھوڑی دیر کے لئے غرور ہو جاتا ہے، کہ شاید ہمارا پہلا زمانۂ سعادت پھر عود کر آیا ہے،

عربی ہندوستان کی زبان نہین لیکن دنیا میں بحمد اللہ ایسے ملک موجود ہیں، جہان کی زبان عربی ہے، اور جہان عربی کتابون کی مانگ ہی، پھر بھی جو چیز اس ہندوستانی دائرہ کو دوسرے عربی بولنے والے ملکون کے مطبعون اور ادارون سے ممتاز کرتی ہی، وہ یہ ہے کہ دائرہ نے اپنے کامون میں کبھی تجارتی نقطۂ نظر کو دخل نہیں دیا، اور دوسرے عربی ملکون نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، ساتھ ہی دائرہ نے بازار کو دیکھکر متاع پیش نہیں کی، بلکہ ضرورت اور حاجت اور افادہ پر اسکی نظر رہی، یہی سبب ہے کہ آج دائرہ کے خدمات تمام اسلامی دنیا میں مانے جاتے ہیں، اور سرکار آصفیہ کی یہ وہ



سعادت ہی، جس میں آج کوئی اسلامی حکومت اسکی حریف نہیں،

دائرہ یون تو ہمیشہ اپنے کامون میں مستعد ہے، مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ اعلیٰ حضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی میں جب سے نواب حیدر نواز جنگ سر اکبر حیدری نے اوسکی صدر نشینی اور نواب مہدی یار جنگ بہادر نے اسکی معتمدی قبول کی ہے، اور اہتمام کی عنان بعض پرجوش کارفرما نوجوانون کے ہاتھوں میں آئی ہے، اسکی حیثیت اور قدر و قیمت میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے،

اسی ترقی کا ایک قدم وہ ہے، جس کا ذکر اس مضمون کا سرعنوان ہے، ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے، کہ دائرہ نے اب یہ کوشش کی ہے، کہ وہ سال میں ایک دفعہ پورے ملک کے عربی کے علما و محققین کو ایک مجلس کی شرکت کی دعوت دے، چنانچہ اس مجلس کا پہلا اجلاس ۹-۱۰-۱۱-۱۲ جولائی ۳۷ئہ کو حیدرآباد دکن میں ہوا، ملک کی اکثر یونیورسٹیوں کے عربی پروفیسر اور بعض علما ان تاریخون میں دائرہ کے جلسوں میں شریک ہوئے، اور اپنے اپنے مقالے اور مضمون پڑھکر سنائے اکثر مقالے عربی میں لکھے گئے تھے، اور عربی ہی میں پڑھے گئے،

**افتتاحیہ جلسہ** اس کا افتتاحیہ جلسہ ۹ر جولائی کو ۹ بجے دن سے ۱۰ بجے دن تک حیدرآباد دکن کے باغ عامہ کے اندر ٹاؤن ہال میں ہوا، وسیع ایوان ارکان سلطنت، اہل علم، اور مستعد طلبہ سے بھرا تھا، دولت آصفیہ کا صدر اعظم جلسہ کا صدر نشین تھا، سارے مجمع پر خاموشی چھائی تھی، کہ دفعۃً قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد نے اپنی جلال بھری آواز میں خالق ذوالجلال کے کلام سے لرزہ پیدا کر دیا، اس کے بعد صدر اعظم بہادر نے اپنا اردو خطبہ پڑھا، جس میں دائرہ کے خدمات کی تحسین تھی، اور آخر میں اعلیٰ حضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کا شاہانہ پیام پڑھکر سنایا، جو عام اہل علم اور خاص دائرہ پر خسروانہ لطف و کرم سے معمور تھا،

اس کے بعد نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیمات و سیاسیات، سرکار عالی معتمد دائرۃ المعارف

نے اپنا دلچسپ خطبہ پڑھکر سُنایا، جو عام طور پر پسند کیا گیا، اس کے بعد ایک یمنی فاضل مولانا عبداللہ صاحب رفیق دائرۃ المعارف نے اپنا عربی قصیدہ پڑھا،

آج جمعہ کا دن تھا، اس لئے ۱۱ بجے کے بعد جلسہ ختم کر دیا گیا، باہر کے اکثر مہمانوں نے نماز جمعہ مکہ مسجد میں ادا کی، قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد نے حسب دستور زبانی خطبہ پڑھا جس میں برجستہ قرآنی آیتوں کی تضمین بہت موثر تھی، تمام ہندوستان میں آج حیدرآباد ہی وہ ملک ہے، جہاں کے منبر سے بارہ سو برس کی دیرینہ رسم کی یاد تازہ ہوتی ہے یعنی خطبہ کے آخر میں خطیب سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ کا نام لیکر دعا کرتا ہے،

پہلا جلسہ | دائرہ کا پہلا عام اجلاس ۱۰ جولائی کو ۳ بجے شام سے ۵ بجے شام تک بلدیہ کے اسی وسیع ونمائش ہال میں ہوا، نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر کی کرسی پر جلوہ افروز تھے، سب سے پہلے شیخ ابراہیم حمدی صاحب مدنی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ نے جو آجکل خوش قسمتی سے یہاں موجود تھے، قرأت کی، اس کے بعد پروگرام میں سب سے پہلے ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

کے اصول پر راقم الحروف کا نام تھا، راقم نے چھٹی صدی کے مشہور مسلمان فلسفی ابوالبرکات بغدادی کی غیر مطبوعہ کتاب المعتبر پر زبانی تقریر کی، مقالہ لکھا ہوا ہاتھ میں موجود تھا، جو عنقریب شائع ہوگا، یہ وہ مسلمان فلاسفر ہے جس نے ارسطو کے فلسفہ اور منطق پر ایسی ناقدانہ کتاب لکھی ہے، جسکی تعریف و توصیف ہر زمانہ کے باکمال اہل علم نے کی ہے، یہ تقریر پون گھنٹہ میں پوری ہوئی،

میرے بعد مولینا عبدالعزیز صاحب میمن پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ جو ابھی اسی سال اسلامی ملکوں کی علمی سیاحت کرکے واپس آئے ہیں میں نے اسلامی ملکوں کے کتب خانوں میں کیا کیا دیکھا" کے عنوان پر فصیح عربی میں ایک مضمون پڑھا جس میں ان کے اس سفر کا حال اور مصر و شام و عراق اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کی اُن نادر کتابوں اور نسخوں کا تذکرہ تھا، جنکو انھوں نے اپنے اس سفر میں دیکھا تھا مضمون دلچسپ اور پر معلومات تھا،



ان کے بعد مولینا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کھڑے ہوئے اور شیخ محی الدین ابن عربی کے فلسفہ پر ایک محققانہ عربی مضمون پڑھا جس میں پہلے یہ دکھایا تھا کہ ہمارے مجتہدین کرام نے فقہ کی تدوین کرکے کس طرح اسلامی قانون کو بادشاہوں کے تصرف سے آزاد کیا، اسی سلسلہ سے وہ اندلس پہونچے، اور مالکی مذہب کے وہاں کے ملکی مذہب ہونے کا سبب بیان کرکے ابن رشد اندلسی کے فلسفہ کی تشریح کی، اور پھر بتایا کہ محی الدین ابن عربی نے کس طرح ابن رشد کے مشائیانہ فلسفہ کی بیخ کنی کرکے اپنا فلسفۂ وحدۃ الوجود پیش کیا،

پہلے جلسہ کا پروگرام اسی مضمون پر ختم ہو گیا،

دوسرا اجلاس | دائرہ کا دوسرا عام اجلاس شہر سے چھ سات میل دور عثمانیہ یونیورسٹی کے ایوان عام میں ہوا، ڈاکٹر عبدالحق صاحب عربی پروفیسر جامعہ عثمانیہ اس جلسہ کے صدر تھے، حاضرین میں علماء اور اہل علم کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبہ کی تعداد زیادہ تھی، سب سے پہلے قاری روشن علی صاحب ناظر القراء سرکار عالی نے چند آیتیں تلاوت کیں، پھر ڈاکٹر داؤد پوٹا صاحب پروفیسر عربی اسماعیل کالج بمبئی نے عربی میں ابن خلدون کے فلسفہ اجتماع پر ایک مضمون پڑھا، پروفیسر موصوف آج کل ابن خلدون کے مقدمہ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، مضمون دلچسپ اور دلپذیر تھا،

اس کے بعد مولینا شیخ عبدالرحمان صاحب یمانی رفیق دائرۃ المعارف نے عربی میں علم اسماء الرجال اور اسکی اہمیت پر ایک مضمون سُنایا، جسکو موصوف نے محنت سے لکھا تھا،

بعد ازیں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر اصول فقہ و قانون جامعہ عثمانیہ نے اردو میں "عہد نبوی کے اولین دستور مملکت" پر ایک محققانہ مقالہ پڑھا، آنحضرت صلعم نے مدینہ منورہ آنے کے بعد مسلمانوں اور

یہودیوں کے درمیان جو عہد نامہ مرتب فرمایا تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس عہد نامہ کے تمام اجزار کیجا کئے تھے، اوران میں سے ہر ایک کی تشریح کی تھی، اور بتایا تھا، کہ اس عہد نامہ کی حیثیت ایک مملکت کے اساسی دستور کی ہے،

اس کے بعد مولینا سید احمد اللہ صاحب ندوی رفیق دائرۃ المعارف نے مسلمانون کے علم جراحی (علم صناعۃ الجراحہ) پر عربی میں اپنا مضمون سنایا، اور عرب جراحوں کے آلات کی تشریح کی،

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ہندوستان میں ایک عربی اکاڈیمی (المجمع العربی) کے قیام کی ضرورت پر عربی مضمون پڑھا جس میں خطابت کی پوری شان تھی، موصوف نے مدرسہ نظامیہ سے پڑھکر مصر اور پھر یورپ جاکر تحصیل علم کی ہے،

**تیسرا اجلاس** دائرہ کا تیسرا عام اجلاس جامعہ عثمانیہ کے ایوان تقریر میں دوسرے دن پھر ساڑھے دس بجے دن سے شروع ہوا، جلسہ کے صدر نواب محمد یار جنگ بہادر تھے، نواب موصوف نسلاً عرب ہیں، سرکار آصفیہ کی اعلیٰ ملازمت (صوبہ داری) میں عمر بسر کی ہے، اور اس پیری اور کبر سنی کے باوجود علمی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں، چنانچہ دائرہ کے وہ ایک معزز عہدہ دار بھی ہیں،

آج کے جلسہ کا آغاز قاری عبدالرحمن صاحب شیخ التجوید مدرسۂ نظامیہ نے اپنی قرأت سے کیا، اس کے بعد ڈاکٹر حسین الہمدانی پروفیسر عربی الفنسٹن کالج بمبئی نے اپنا عربی مضمون بڑی خوبی سے پڑھا، مضمون کا عنوان "کتاب الریاض لاحمد الکرمانی" تھا، یہ تیسری صدی کا اسماعیلی متکلم اور فلسفی تھا، اور فارابی کا معاصر تھا، ڈاکٹر ہمدانی اصل میں یمن کے باشندہ اور اسماعیلی مذہب کے بڑے واقف کار ہیں، یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسماعیلی کتابوں سے دنیا کو آشنا کیا ہے، ورنہ وہ اب تک راز کے طور پر چھپائی جاتی تھیں، موصوف نے اپنے مضمون کے شروع میں اسماعیلی ادبیات کی تھوڑی سی مجمل تاریخ بھی بیان کی،



ان کے بعد ہمارے پرانے دوست مولینا عبداللہ العمادی نے جو دکن جاکر ہندوستان سے گم ہو گئے ہین، ابن ہیثم کے علم مرایا و مناظر پر ایک عربی مضمون پڑھا، بعد ازین دمشق کے عالم علامہ مامون ارزنجانی نے عربی زبان کی تعلیم اور طریقہ تعلیم کے مسئلہ پر عربی میں تقریر کی، اور شام میں عربی زبان کے ابجد کے قواعد اور ریڈرین جو نئے اصول کے مطابق لکھی گئی ہیں، اُن کو پیش کیا، اور طلبہ کو اصلاح دینے کے نئے طریقے کے نقشے دکھائے،

اسکے بعد ہمارے نوجوان فاضل مولوی عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی مددگار معجم المصنفین نے جن کو ہمارے خیال میں قیم المصنفین کہنا صحیح ہوگا، ایک عربی کتاب "کتاب المخترع فی فنون من الصنع" پر ایک عربی مضمون پڑھا، کتاب کے مصنف کا حال گو معلوم نہیں، مگر یہ نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ میں ہے ہندوستان کا لکھا ہوا ہے، اور ضیا ترک قاضی تمان ناگوری کے قلم کا ہے، اس کتاب میں مختلف منقول اور صناعیوں کے نسخے اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور اس لحاظ سے اسکی خاص اہمیت ہے، یہ نسخہ ۸۶۲ھ کا لکھا ہے،

ان کے بعد مولینا امتیاز علی خان عرشی ناظم کتبخانہ سرکاری رامپور نے امام سفیان ثوری کی تفسیر پر اردو مضمون پڑھا، اس تفسیر کا نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں ہے، (معارف میں بھی اس کتاب پر ایک مضمون عرشی صاحب لکھ چکے ہین) مضمون کے آغاز میں ثابت کیا گیا تھا، کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے قرآن ہی کی خدمت کی، اور تفسیر پر کتاب لکھی،

جلسہ کے آخر میں نواب محمد یار جنگ بہادر نے اپنا مختصر خطبۂ صدارت پڑھا، اور جلسہ ختم ہوا، آج یہیں جامعہ عثمانیہ کے بورڈنگ میں مہمانوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، جسمیں خود وزیر تعلیم وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے دوسرے پروفیسر اور تعلیمی حکام شریک تھے،

**چوتھا اجلاس** آج دائرہ کا آخری اجلاس تھا، یہ ٹون ہال میں منعقد ہوا، مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ صدارت کی کرسی پر متمکن ہوئے، مولوی حسن شاہ صاحب نے

قرأت کی، اس کے بعد مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی مہتمم اعلی دار العلوم دیوبند وصدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل نے علم وحی کے بری عن الخطا ہونے پر تقریر کی، اور تجویز پیش کی، کہ دائرہ اب علوم القرآن کی طرف توجہ کرے، اور ان فنون کی کتابیں شائع کرے،

اس تقریر کے بعد شمس العلماء مولانا عبد الرحمن صاحب عربی پروفیسر دہلی یونیورسٹی نے "کلمۃ فی المستشرقین" کے عنوان سے ایک عربی مضمون پڑھا اور اسکی تشریح کی، اس مضمون میں مستشرقین یورپ کی تاریخ اور ان کے عیب و ہنر پر کلام تھا،

اس کے بعد ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے "ادبیات علم حدیث" پر ایک دلچسپ مضمون اردو میں پڑھکر سنایا، اس میں موصوف نے یورپ کے مستشرقوں نے علم حدیث پر جو زہر اگلا ہے، اُس کا تریاق پیش کیا تھا، اور دکھایا تھا، کہ ہمارے علم حدیث کی چند خاص خصوصیتیں ہیں، ایک اسناد، یعنی ہر واقعہ کے بیان میں واقعہ کے آخر شاہد تک پہنچنا، اس سلسلہ میں بتایا کہ دوسری قوموں میں اسناد کا پتہ کہاں تک چلتا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ محدثین سلاطین زمانہ کے دربار سے یکسر بے تعلق رہے، اور جن ایک دو کو تعلق بھی تھا، تو وہ آزاد اور حق گو رہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین اسلام بھی اپنی حیثیت کے مطابق شریک رہیں، چوتھی خصوصیت وہ حزم واحتیاط ہے، جو محدثین نے روایتوں میں برتی ہے، آخر میں فاضل مقرر نے علم حدیث کے نشر واشاعت اور تعلیم میں ائمہ اور شیوخ نے جو محنتیں کی ہیں، ان کا مختصر مگر دلپذیر حال بیان کیا،

آخر میں مولینا سید ہاشم صاحب ندوی ناظم دائرۃ المعارف اپنا مضمون پڑھنے والے تھے، مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے پڑھ نہ سکے، اور عربی علوم وفنون اور عربی زبان کی یہ پہلی کانفرنس اعلیٰ حضرت آصف سابع کی سلامتی کی دعا پر ختم ہوئی،

"س"



# تلخیص و تبصرہ

## سیرت کا مولد

(بسلسلہ گذشتہ)

جیسا کہ کہا گیا ہے، ماں وہ زمین ہے، جس میں ہماری جڑیں نصب ہیں، لیکن باپ، یوں کہنا چاہئے کہ آسمان کی جانب اشارہ کرتا ہے، جدھر ہمیں بڑھنا ہے، باپ ان مطالبات کا قائم مقام ہے، جو انسان پر دنیا کی طرف سے ہوتے ہیں، وہ ایک خارجی معیار قائم کرتا ہے، وہ فرض منصبی کا احساس پیدا کرتا ہے، وہ کامرانی کے تصور کو مجازی صورت میں پیش کرتا ہے، اس کے اندر اختیار و حکومت کے اصول کو مجسم شکل میں دیکھتے ہیں،

باپ کی محبت تمامتر ایک مختلف قسم کی محبت ہے، جب کہ ماں کی محبت ایک ہمہ گیر جوش ہوتی ہے، اور اس کا اظہار سیدھے سادے اور بے تکلف طریقہ پر بچہ کی اصلی ہستی کی قدرشناسی میں ہوتا ہے، باپ کی محبت بچہ کی مخصوص اہلیتوں اور معین کامرانیوں کے اقرار واعتراف کی شکل اختیار کرتی ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ الفاظ میں تعریف و توصیف کرے، اور بچہ کو اس بنیادی اور لازمی قدر واعتراف سے واقف کردینا نہایت ضروری ہے، باپ کو چاہئے کہ بچہ کو سعی و کوشش کے لئے ابھارے، ایک ایسے معیار کے لئے جد وجہد کرنے کی ترغیب دے جو گو اصل میں تو باپ کا ہے، تاہم بچہ کے لئے ضروری ہے، کہ اُسے اپنا سمجھ کر قبول کرے، اگر اور جب بچہ اپنے اندر اس معیار کے مطابق عمل کرنے کی اہلیت محسوس کرتا ہے، اور اس سے بڑھ کر اگر

اور جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کا باپ اُس کو اس معیار کے مطابق عمل کرنے کا اہل سمجھتا
ہے، تو اُسے احساس ہوتا ہے، کہ اس کی قدر پہچان لی گئی، اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے،
ماں سے بچہ خود اعتمادی حاصل کرتا ہے، اور باپ سے اعتماد علی النفس، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں
کہ جس بچہ کے کارنامے شروع بچپن میں تسلیم نہیں کئے جاتے' وہ بعد میں اس ابتدائی نقصان
کی تلافی نہیں کر سکتا، وہ اپنے ناکام و نامراد ہونے کے احساس کیساتھ بڑھتا ہے، اور آیندہ
زندگی کی کوئی کامیابی اس ذہنی کیفیت کو بدل نہیں سکتی' ایسے بعض بچے دراصل ناکام رہتے ہیں
کیونکہ وہ اپنے کو ناکام خیال کرتے ہین، اور بعض اپنی کامیابی کا لطف اٹھانے سے معذور رہتے
ہیں، خواہ وہ کامیابی کتنی ہی بڑی ہو، کیونکہ ان پر ہمیشہ کسی نہ کسی آفت کا خطرہ طاری رہتا ہے
غالباً ان بُرے نتائج کے اصلی سبب کا سراغ باپ کی صرف ایک غلطی میں پایا جاسکتا ہے
یعنی حد سے زیادہ دوری، حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں، پس اگر وہ گھر پر ہمیشہ تھکا ہوا
اور سوچ اور فکر میں غرق رہتا ہے، تو اس کے اور بچہ کے درمیان صحیح تعلق قائم نہ ہوگا، اس
کا بچہ اُسے باپ سے زیادہ خاندان کا پرورش کرنے والا سمجھے گا، اور خاندان کی پرورش کا بار اُور
زندگی کی سختیاں بچہ کی نظر میں حد سے زیادہ اہم دکھائی دین گی، اس سے بھی زیادہ بُرا ہے،
اگر باپ اخلاقی حیثیت سے بچہ سے بہت دور ہے، اور ایسے بلند معیار قائم کرتا ہے، جن
تک بچہ کی رسائی ناممکن ہے تو یہ چیز احترام و اقتدار کے شعور کا تو باعث ہوتی ہے، لیکن بے
تکلفی کو بے لطف کر دیتی ہے، اور اُبھارنے اور ترقی دینے کے بجائے بچہ کی ہمت کو پست اور
اس کے حوصلوں کو افسردہ کر دیتی ہے،

(۴)

ان چند باتوں سے ناظرین پر گھر کی فضا کا تخیل واضح ہوا ہوگا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ



مناسب اور نامناسب ماحول کا ردعمل بچوں پر کیا ہوتا ہے، بچہ یا والدین ہونا کوئی آسان بات نہیں بچوں
کی تربیت کا مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے، اس کی پیچیدگیاں ایسی ہیں، کہ ان پر نہ والدین آسانی سے قابو
پا سکتے ہیں، اور نہ بچے خوش قسمتی سے بچوں میں ہر قسم کے اثرات کی مقاومت کی قوت بہت ہی
سخت ہوتی ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے، کہ ان میں اچھے اثرات کے قبول کرنے کی صلاحیت نسبتہً
زیادہ ہوتی ہے، ان میں خوش رہنے کا مادہ حد سے زیادہ ہوتا ہے، جس کو زائل کرنا محال ہے،
بہت ہی ناخوشگوار حالات میں بھی بچے خوش رہ سکتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنج بالغوں
ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اور بلوغ کی منجملہ اور نشانیوں کے ایک نشانی یہ بھی ہے، ہاں
ایک بچہ مغموم، رنجیدہ، اور کسی چیز سے خوفزدہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس کے رنج و غم کی سطح کے قریب
ہی مسرت اور محبت کی لہریں برابر اُٹھتی رہتی ہیں، مگر ہم میں بعض بدقسمت لوگ ایسے ہین جوان
سرد بچوں کو سن بلوغ تک پہونچتے پہونچتے خواہ مخواہ مغموم بنا دیتے ہیں، میرے سامنے اس وقت
دو بچوں کی مثالیں ہیں، ایک پندرہ سال کا لڑکا ہمیشہ چیختا چلاتا، اور گایا کرتا تھا جس سے اس
کے اسکول اور گھر کے لوگ پریشان رہتے تھے، اس نے مجھ سے کہا "مجھ میں خوشی کی ابلتی ہوئی قوت
بھری ہے، جس کو میں اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں"، ایک دوسرا لڑکا سولہ[17] سال کا تھا، جو ہر قسم
کی مشکلوں میں گھرا رہتا تھا، وہ اپنی زندگی سے عاجز تھا، وہ جو کام کرتا راس نہیں آتا تھا پھر بھی وہ
خوش رہتا تھا، ایک روز اس نے مجھ سے کہا "میں اکثر سوچتا ہوں کہ مسرت کا جذبہ میرے لئے کس
قدر ناموزون ہے" لیکن مسرت تو خدا کا عطیہ ہے، یہ کوئی انسان کی حاصل کی ہوئی چیز تو نہیں ہمارا
فرض صرف اس کو برقرار اور قائم رکھنا ہے، اس کے لئے صرف اس بات کی ضرورت ہے
کہ ہم لڑکوں کو مصیبتوں، مشکلوں اور خطروں سے محفوظ رکھین، کیونکہ یہی چیزیں ہیں، جو ان کی
اصلی مسرتوں کو برباد کر کے ان سے اصلی اعتماد کو زائل اور ان کی محبت کو نفرت میں تبدیل کر دیتی ہیں

بچوں کے گوناگون مصایب اور مشکلات کے مسئلے تین حصّوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ان کی

(۱) اجتماعی زندگی کا مسئلہ (۲) ضبط ونظم کا مسئلہ (۳) کام کا مسئلہ،

اجتماعی زندگی کے مسئلہ سے میرا مطلب یہ ہے، کہ ایک بچہ کو دوسرے سے ملنے اور اپنی صحبت کے صحیح انتخاب کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یا تو وہ الگ تھلگ اور بالکل تنہا ہو جاتا ہے، یا بچوں سے ملنا چاہتا ہے، لیکن نہیں مل سکتا، ہر ان دونوں مشکلوں کے اسباب ظاہر ہیں، بچہ جب پہلی دفعہ اجتماعی زندگی یعنی اپنے خاندان والوں کی صحبت میں داخل ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ کوئی ایسا غلط رویہ اختیار کر لیا جاتا ہے، جس سے اس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ خاندان کی اجتماعی زندگی میں مساویانہ اور مکمل حیثیت نہیں رکھتا ہے، لامحالہ وہ اپنی دنیا میں چلا جاتا ہے، جہاں وہ اپنے کو تنہا پاتا ہے نہیں تو پھر وہ اسی کوشش میں رہتا ہے، کہ کسی صورت سے وہ گھر کی بہشت ممنوعہ میں پہونچ جائے اس کے اثرات اکثر بہت ہی خراب مرتب ہوتے ہیں، اس قسم کے دو لڑکوں کی مثالیں میرے سامنے ہیں، ایک نے چوری، دوسرے نے اپنے گھر کی چیزوں کو فروخت کر کے اپنے رفقا اور اساتذہ کو تحائف دینے شروع کئے، ان دونوں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ گھر میں نہ سہی تو باہر اس تدبیر سے انکے دوست آسانی سے پیدا ہو جائیں گے،

انضباط کا سوال ذرا اہم ہے، منضبط ہونے کے معنی یہ ہیں، کہ ہم کو یہ احساس ہو کہ ہماری داخلی ضرورتوں سے بالا کچھ خارجی قوانین ایسے ہیں، جن کے مطابق ہم کو بننا ضروری ہے، اس ناخوشگوار اور تکلیف دہ حقیقت کا احساس بچوں کو ڈھائی برس کی عمر ہی میں ہو جاتا ہے، اس سن میں بچہ اپنی اور اپنے ماحول کی خواہش میں تصادم پاتا ہے، اس تصادم سے اس میں ضد پیدا ہو جاتی ہے، یہ ضد کا پہلا دور ہوتا ہے، یہ دور بالکل فطری ہے جو ہر بچہ میں پایا جاتا ہے، اگر اس مشکل دور کو والدین دانشمندانہ اور ہمدردانہ طریقہ پر گذار لے جائیں، تو چھ مہینے میں بچہ کی صحبت پذیری غیر شعوری سے شعوری میں تبدیل



ہو جاتی ہے، لیکن والدین بچہ کی فطری کیفیات سے ناواقف ہو کر اس کی ضد سے جنگ کرنے لگیں، اور اسکی طبیعت کے مدارج کو مکمل نہ ہونے دیں گے، تو پھر اس میں ناقابل علاج ضد پیدا ہو جائے گی، میں بہت کم ایسے بچوں سے ملا ہوں، جو انضباط کی اہمیت کو نہ سمجھتے ہوں، لیکن شاید ہی کوئی اس کا تطابق اپنی عملی زندگی سے کرتا ہو، کسی چیز کو سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ اندرونی ذاتی تجربے وابستہ نہ ہوں، بچے جانتے ہیں کہ ان کو کیا کرنا ہے، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کریں، لیکن اندرونی طور پر کوئی چیز ان کو کرنے سے روکتی ہے، یہ کوئی چیز وہ خیال ہی جو انضباط اور تحکم کے ذریعہ سے برباد ہو گیا ہو، ان میں بعض بچے تو ایسے ہوتے ہیں جن کی تربیت غیر منظم اور غیر منضبط گھر میں ہوتی ہے، اور بعض ایسے ہیں جنھوں نے ضرورت سے زیادہ منضبط ماحول میں تربیت پائی ہے، دونوں نتائج کے لحاظ سے بچوں کے لئے مہلک ہیں، خود روئی کی محرومیت سے زندگی کی اصلی آب جاتی رہتی ہے، بچوں کی طبیعت کے نشوونما کے سلسلہ میں بعض نتائج بہت ہی تعجب انگیز واقع ہوتے ہیں، میں ایک ایسے خاندان سے واقف ہوں جس کا سرپرست ایک نہایت عمدہ انسان تھا، اس کو غیر معمولی تجربے حاصل تھے، علمیت اور صلاحیت بھی تھی، مہربان اور رحمدل بھی تھا، اور خود اعتمادی کی قوت بھی بہت زیادہ تھی، لیکن اس کی فوق الانسانی خوبیاں اس کے لڑکوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں، وہ اپنے لڑکوں کو اپنی ہی قابلیت کا نمونہ دیکھنا چاہتا تھا، لیکن یہ لڑکے اسکی خواہش اور تربیت کے مطابق نہ ہو سکے، بلکہ ہر ایک نے اپنی راہیں علٰحدہ اختیار کیں، ایک بہت ہی ضدی ہو گیا، دوسرا اشتراکی تخیل سے متاثر ہو گیا، اور تیسرا ہر فن مولا ہو گیا،

ضرورت سے زیادہ اور کم انضباط کے علاوہ ایک اور قابل غور اور اہم چیز ہے، عام طور سے والدین نادر حکم اور تحکم، استبداد اور انضباط میں فرق نہیں کرتے، اس سے زیادہ یہ کہ وہ بچوں کے لئے جو یکساں معیار بناتے ہیں، اس پر ہر وقت قائم نہیں رہتے، جس سے بچوں میں بددلی اور نا انصافی کا جذبہ پیدا

ہوتا ہے، کیونکہ بچوں میں فطری طور پر عدل و انصاف کا جذبہ موجود رہتا ہے، یہ تو انسانی طبیعت کی بہت ضروری شے ہے، انصاف ہی کی قوت سے ایک بے بس اور کمزور بچہ جی سکتا ہے، اور اگر باپ جس کو بچے عدل و انصاف کا مجسمہ سمجھتے ہیں، اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، تو بچہ کی امیدوں پر پانی پڑ جاتا ہے، وہ اپنے باپ بلکہ دنیا سے اعتماد کھو بیٹھتا ہے، اور ایک نئی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس میں اپنی پستی کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے، اب وہ کسی تحکم کو فی نفسہ ناپسند نہیں کرتا، بلکہ تحکم کرنے والے کے حق تحکم کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، باپ جب اپنے تحکم کے فرض کی ادائگی میں ناکام ثابت ہوتا ہے، تو بچہ پھر کسی اور کے تحکم کے سامنے سر خم کرنا مطلق پسند نہیں کرتا، اس طرح اس میں جنگ جوئی، اخفا پسندی، کج بحثی اور ضد کی ناخوشگوار عادتیں پڑ جاتی ہیں اور وہ متشکک، جھوٹا اور چرب زبان بن جاتا ہے، ان تمام خصوصیات کو مایوسی اور فقدان اعتماد کی نشانی اور کمزوروں کا طاقتوروں کے خلاف آلۂ جنگ سمجھنا چاہئے،

جہانتک کام کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ مذکورہ بالا دونوں مسائل سے زیادہ اہم نہیں کیونکہ ان کا انحصار ان ہی اسباب اور حالات پر ہے، جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ہر شخص کے لئے خواہ بچہ ہو یا جوان کام کرنے کے لئے کوئی سبب ہونا چاہئے، گو عمر کے ساتھ یہ سبب بھی بدلتا جاتا ہے، شروع میں ایک بچہ کسی کو خوش کرنے کے لئے کوئی کام کرتا ہے "کسی کو" سے مطلب والدین ہی ہیں اگر والدین اس کے کام سے خوش نہیں ہوتے، یا خوش نظر آنے کی کوشش نہیں کرتے تو اسکی دلچسپی کام سے جاتی رہتی ہے، اور بعض جوان اور سن رسیدہ اشخاص تو تمام عمر کسی کو خوش رکھنے کے لئے کام کرتے رہتے ہیں ان کے "کسی کو" سے مراد ان کے نیچے ہوتے ہیں، اس طرح ایک دائرہ ہے، جو خود بخود مکمل ہوتا رہتا ہے

اس کے بعد وہ دور شروع ہوتا ہے جب بچے وہ کام کرتے ہیں جو ان کو کرنا پڑتا ہے اس کام کو



ہم فرض سے منسوب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ زیادہ شعوری اور جبری نہیں ہوتا، بلکہ اس دور میں ان کے دماغ کے رجحانات ایسے ہوتے ہیں، کہ وہ اپنے اور ماحول میں اپنی فاعلیت اور انفعالیت میں اپنی ضرورتوں اور پابندیوں میں بالکل ہم آہنگی پاتے ہیں لیکن جب وہ سولہ برس کے ہو جاتے ہیں، تو یہ توازن باقی نہیں رہتا، بلکہ ان کے عنفوان شباب کیساتھ ان میں ایک نئی قسم کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں، ہر چیز کے اسباب جاننا چاہتے ہیں، اور اسی زمانہ میں ان کے سامنے زندگی کے مقصد کا سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے،

اب اگر انکے کاموں پر خوشی کا اظہار کر کے ان کی کوششوں کی تعریف نہیں کی جاتی، ان کو کام کرنے کا احساس نہیں دلایا جاتا، اور ان کو ان کی زندگی کا مقصد نہیں بتایا جاتا، تو ایسے لڑکے اسکول میں عموماً ناکام رہتے ہیں، ان کی ناکامی کے اسباب یہ نہیں ہوتے، کہ ان میں کام کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، بلکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ کام کرنے کے لئے مندرجہ بالا اسباب میں سے کوئی سبب بھی ان کے سامنے نہیں ہوتا، کام کی خرابی، دلچسپی یا توجہ کا فقدان، جسم، یا ذہن کی گندگی، اسکول کے کاموں میں غفلت یہ سب ان ہی اسباب کے فقدان کے نتائج ہیں،

سب سے اہم مسئلہ زندگی کے مقصد کا تعین ہے، کوئی مقصد اصلی اور حقیقی نہیں ہو سکتا، اگر وہ بیرونی طریقہ سے متعین کر دیا گیا ہو، مثلاً کوئی طالب علم جغرافیہ محض اس لئے پڑھے کہ اس کے کسی استاد نے پڑھنے کا حکم دیا ہے، کوئی شخص اپنے ملک سے محبت اس لئے کرے کہ ملک کے آمر نے حکم دیا ہے کوئی تجارت اس لئے کرے کہ اس کے باپ کی یہی خواہش ہے، کوئی دولت اس لئے جمع کرے کہ اس کو جمع کرنا ہے، تو یہ زندگی کے مقاصد نہیں کہے جا سکتے، زندگی کا مقصد تو وہ ہے کہ جس کی تکمیل کے لئے اندرونی قوتیں خود بخود بروئے کار آئی ہوں، اور یہ معجز نما قوتیں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں، جب کہ وہ فطرت کی ذی روح اور غیر ذی روح چیزوں کی عظمت، عزت، اور قدر کرنا سیکھیں

ہم ایک انسان کی عظمت اس سے محبت کر کے، ایک صنعتی چیز کی قدر اس کو استعمال میں لا کے اپنی عزت اپنے میں فطرت کی ودیعت کی ہوئی قوتوں کی تکمیل کر کے کر سکتے ہیں، یہی عزت وعظمت کا جذبہ ہم میں زندگی بخشتا ہے، زندگی کو ولولوں سے معمور کر دیتا ہے، مختلف قسم کی دلچسپیاں فراہم کرتا ہے، اور مستقبل کی تاریکی کو روشن بنا دیتا ہے، اور یہی زندگی کا اصلی مقصد بھی عطا کرتا ہے،

تعلیم کی اصلی غایت یہ ہے، کہ بچہ کو مندرجۂ بالا مقصدِ زندگی بتایا جائے، اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے، کہ یہ محض فلسفیانہ خیالات ہیں، جن کے متحمل بچے نہیں ہو سکتے، لیکن یہ صحیح نہیں ہیں، اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سولہ سال کے بعد بچے نہ صرف ان خیالات کو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ ان کو اس طرح سنتے اور ان پر غور کرتے ہیں کہ گویا وہ ان کے بہت دنوں سے منتظر تھے، عزت و عظمت کرنا سکھایا نہیں جاتا، بلکہ خود تجربہ سے سیکھا جا سکتا ہے، اور یہی عزت وعظمت کا تجربہ گھر کے سوا کہیں اور حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ والدین ہی اول اور آخر فطری اور اعلیٰ عظمت کے مالک ہوتے ہیں، یہ تعلیمی نفسیات کا اصول ہے، کہ جو بچے اپنے والدین کی عزت اور قدر و منزلت کرنا نہ سیکھ سکیں، تو وہ ایسی دنیا میں بھٹکتے پھریں گے، جس کی تاریکی میں اپنے آپ اور بنی نوع انسان تک پہنچنے میں کوئی روشنی نہیں مل سکے گی،

"ص، ع"

## سیرۃ النبی حصہ پنجم تقطیع خورد

اس میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، بڑی تقطیع پر حسب دستور ۱۳۵۴ھ میں چھپی تھی، اسی وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، بحمد اللہ کہ اب وہ چھپ کر تیار ہو گئی ہے، حجم ۴۹۲ صفحے قیمت باختلاف کاغذ [illegible] روپے،

"منیجر"



# اخبارِ علمیہ

## سائنس کی بے حقیقتی

ڈاکٹر سر شاہ سلیمان نے شملہ میں ایک لکچر دیتے ہوئے کہا، کہ

سائنس کے تمام نظریے محض قیاسات ہیں، انسان صرف قیاس ہی کر سکتا ہے، وہ بھی شروع میں لازمی طور سے غلط اور بالکل نامکمل؟ اس کو وسیع تجربوں سے اپنی غلطیاں معلوم ہوتی رہتی ہیں، لیکن غلطیاں معلوم ہونے کے بعد وہ ایک قیاس کو چھوڑ کر دوسرا قیاس کر لیتا ہے، اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہیگا، کیونکہ فطرت کے حقائق اس کے دسترس سے باہر ہیں،

سائنس کے نظریوں کی غیر اصلیت اس وقت واضح ہو جاتی ہے، جب ہم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک برقیہ (Electron) کا نصف قطر سینٹی میٹر کا ۱/۵........... ہے، اور وہ اپنے مرکز کے گرد ایک سکنڈ میں کئی کھرب دفعہ گھوم رہا ہے، اگر اس کا رقبہ واقعی ایسا دقیق ہے، تو اس کی ہیئت اور ساخت کو معلوم کرنا ناممکن ہے، انسان کی بصارت بہت ہی محدود ہے، اور کیا معلوم کہ اس سے بھی چھوٹی دنیا کہیں اور نہ ہو، جس سے انسان شاید کبھی واقف نہ ہو،

آفتاب کئی لاکھ گنا زمین سے بڑا ہے، لیکن یہ کائنات کے غیر محدود سمندر میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور ۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ستارے ایسے ہیں، جو آفتاب کے برابر ہیں جن کو کہکشاں گھیرے ہوئے ہے، کہکشاں کا قطر اتنا بڑا ہے کہ اس کی روشنی اگر ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی

رفتار سے چلے، تب کہیں ایک سمت سے دوسری سمت تک ۲۲۲۰۰۰ سال میں پہونچے گی، اور اس کہکشان سے ماورار لاکھوں اور کہکشاں ہیں، جو ۱۰۰ انچ والی دوربین سے معلوم ہوتی ہیں، اور اگر انچ کی دوربین سے دیکھی جائیں گی، تو اسکی روشنی آنکھوں کی روشنی سے لاکھوں گنا زیادہ معلوم ہوگی پھر بھی کائنات کے متعلق معلومات تشنہ اور غیر یقینی رہینگی، ہمارے تخیلات ناقص، نامکمل اور ادھورے ہمارے نظریے محض قیاسات رہیں گے، ہمارے خیالات بہت دور تک پہونچ سکتے ہیں، لیکن مشاہدات ان کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس لئے سائنس کی تحقیقات ہر زمانہ میں غیر اٹکلی رہیں گی

سائنس کی معلومات ہمیشہ غیر اصلی اور غیر حقیقی چیزوں سے وابستہ رہی ہیں، آئنسٹین کے نظریہ کے مطابق فضا محدود ہے، اور انسانی ذہن میں آسکتی ہے، اس نے فضا کے نصف قطر کا حساب بھی لگایا ہے، لیکن یہ انسان کا محض بے بنیاد تخیل ہے کہ وہ کائنات کی لمبائی اور چوڑائی کا حساب لگانے کی کوشش کرے، کائنات کی حد [illegible] محض تخیل کا اختراع ہوگا جس میں کچھ اصلیت نہ ہوگی، سائنس کے نظریے ہر قسم کے اور ہر حد تک قائم کئے جا سکتے ہیں، ایڈنگٹن نے تو کائنات کے برقیہ کی کل تعداد بھی مقرر کر دی ہے، لیکن کیا اس تعداد پر یقین اور سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے؟

دراصل فضا اور وقت دو آزاد چیزیں نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک ہی میں ملا دی گئی ہیں جس میں چار ابعاد (Dimensions) ہیں لیکن وقت فضا کا ساتھ نہیں دیسکتا، اس لئے اس کو ایک خیالی اور حقیقی واحدہ قرار دیا گیا ہے، اور ان دونوں کی آمیزش سے ایک نئی ماورار فضار قائم ہوگئی ہے اضافیت کے نظریہ کے مطابق فضا میں کوئی مادی واسطہ یا ایتھر نہیں، پھر بھی یہ اس کے ساتھ ایک مخصوص عوض مثلاً انحنار (Curvature) وابستہ کرتا ہے، چنانچہ اس لحاظ سے فضا محض خلا نہیں بلکہ اس میں کچھ خاصے ہیں، اور یہ نئی قسم کی فضا محدود ہے، اس میں انحنا پیدا ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ ایک محدود دائرہ بن جاتا ہے، اسمیں لکیریں سیدھی نہیں جاتی ہیں، بلکہ ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، اور جھکتے



جھکتے وہیں پہونچ جاتی ہیں، جہاں سے چلی تھیں، لیکن یہ خیالی حساب یہ نہیں بتاتا ہے کہ یہ خیالی انحنا مثبت ہے یا منفی، اضافیت کے ماہرین اس پر ابھی تک متفق نہیں ہوئے ہیں، پھر اگر یہ ایک محدود دائرہ ہے تو اس سے ماورار کیا ہے؟

اضافیت کے نظریہ کے مطابق فضا غیر معمولی سرعت کیساتھ پھیلتی جا رہی ہے، دراصل یہ وسعت کائنات میں پیدا ہو رہی ہے، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ یہ فضا کس میں پھیلتی ہے، اگر غیر فضا میں پھیلتی ہے، تو یہ بھی فضا ہی ہے، لیکن ماہرین اضافیت کا خیال ہے کہ یہ کسی پانچویں بُعد میں پھیل رہی ہے، مگر یہ تو محض ریاضی کا مغالطہ ہے، جس میں نہ کوئی طبیعاتی معنی ہیں، اور نہ کوئی حقیقت ہے، بلکہ فطرت کو غلط سمجھنے کی دلیل ہے،

روشنی سے متعلق جتنے نظریے قائم کئے گئے ہیں، وہ اور بھی پراسرار ہیں، ایڈنگٹن نے اقرار کیا ہے کہ طبیعیات کے موجودہ اساسی تخیلات بالکل غلط ہیں، اس کو یہ بھی اعتراف ہے، کہ وہ ان غلط تخیلات کو صحیح بھی نہیں کر سکتا ہے، موجودہ تخیل کے مطابق روشنی مادہ اور واسطہ سے بالکل آزاد ہے، تو پھر فضا میں روشنی کی لہروں کا پھیلنا ناقابل فہم ہو جاتا ہے، روشنی کی لہروں کے ماہرین نے اس تخیل کو بہتر بنانے کی ضرور کوشش کی ہے، لیکن روشنی کی ہیئت کا کوئی طبیعاتی تخیل وہ پیش نہیں کرتے وہ تو ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں، انھوں نے مادہ کی بالکل تخریب کر دی ہے، برقیہ کو لہروں کی ایک قطار سمجھتے ہیں، جو ایک لامتناہیت سے دوسری لامتناہیت تک پھیلا ہوا ہے، اسکی رفتار تو معلوم ہے لیکن اس کی جگہ غیر معلوم ہے، لیکن اگر کوئی اس کو روشنی کی مدد سے دیکھنا چاہے تو یہ لامتناہی قطار نقطۂ صفر میں آکر سمٹ جاتی ہے، ایسی حالت میں جگہ تو معلوم ہو جاتی ہے، لیکن رفتار غیر معین ہو جاتی ہے، یہ لہروں کی ایک جماعت ہوتی ہے، جو ہمیشہ آگے بڑھتی، شکل بدلتی اور پھیلتی رہتی ہے، یہاں تک کہ یہ نقطۂ صفر پر سمٹ جاتی ہے، اس وقت اسکو دیکھنے کی کوشش بھی کیجا سکتی ہے،

کہاجاتا ہے کہ روشنی یا برقیہ کی لہر جو ایک دور دراز ستارے سے چلتی ہے، زمین تک پہونچتے پہونچتے ناقابل پیمایش ابعاد میں پھیل جاتی ہے، جب تک یہ کسی چیز سے مس نہیں کرتی ہے، وہ پھیلتی رہتی ہے اور اگر کسی ذرہ سے یہ مس کرگئی تو یہ لامتناہی قطار پھر مجتمع ہو کر نقطۂ صفر میں سمٹ جاتی ہے، تاکہ ذرہ میں داخل ہو سکے، لیکن اس قسم کا تخیل مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، یہ صرف روشنی اور مادہ کی علامتی تعبیریں ہیں،

سائنس کے جدید نظریوں میں مادّہ غیر اصلی چیز ہیں، محسوسات غیر محسوسات میں حقیقت غیر حقیقت میں محض تبدیل ہو کر رہ گئی ہے، مادہ ایک لامتناہی لہرون کی جماعت سمجھا جاتا ہے، جو لامتناہی طور پر پھیلیا جاتا ہے، اور جب کسی مادہ سے ملتا ہے، تو سمٹ کر ایک نقطہ پر آجاتا ہے، یہ لہرین قوت ([illegible]) کی لہرین نہیں ہیں، لیکن ان کو ریاضی اور سائنس کی اصطلاح میں مختلف [illegible]موں سے منسوب کرتے ہیں، بات یہ ہے، کہ وہ کوئی حقیقی لہرین نہیں، بلکہ وہ خیالی، مصنوعی اور علامتی لہرین ہیں، اسی لئے مادّہ بھی ایک خیالی لہر کی تصویر ہے، جن کو ریاضی کے نشانات میں ظاہر کرنیکی کوشش کیجاتی ہے، ان کا تصوّر ذہن میں نہیں آسکتا، اور چونکہ یہ محض خیالی ہیں، اس لئے فضا اور وقت میں ان کی جگہ بھی متعین نہیں کیجاسکتی ہے، اسی طرح موجودہ سائنس کائنات کی ہر چیز کی ایک خیالی تصویر پیش کر رہا ہے، جس کا دیکھنا تو کیا ذہن میں تصور قائم کرنا بھی ناممکن ہے،

"ص ع"

---

## مقالات شبلی جلد ہفتم فلسفیانہ

جسمیں فلسفہ یونان و اسلام، یونانی منطق کی غلطیان، اجرام فلکی، حقائق اشیا، جذب یا کشش، مسئلہ ارتقا، وڈاردن جیسے معرکۃ الآرا مسائل و مباحث پر سیر حاصل مقالات ہیں، ضخامت ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۲ار "منیجر"



# باب التقریظ والانتقاد

## رسالون کے خاص نمبر

گذشتہ مہینے جگہ کی کمی کے سبب سے بہت سے رسائل اور اخبارات پر ریویو رہ گیا تھا، وہ اس مہینہ میں کیا جاتا ہے،

**ہمدرد صحت دق وسل نمبر** — مرتبہ حکیم حاجی عبد الحمید صاحب دہلوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ار پتہ ہمدرد منزل دہلی،

دہلی کا مشہور طبی رسالہ "ہمدرد صحت" عالمگیر مہلک امراض پر نہایت مفید خاص نمبر نکالتا ہے جس میں ان امراض کے جملہ متعلقات پر نہایت مبسوط اور محققانہ مضامین ہوتے ہین، اس سے پہلے انہی خصوصیات کے ساتھ عورت نمبر نکال چکا ہے، اب اس نے دق وسل پر یہ خاص نمبر نکالا ہے، یہ نمبر اس موضوع پر اردو میں معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے، اس میں دق وسل کی ماہیت، اس کے اقسام، مختلف اعضا کی دق، مرض کے مراحل، تدابیر حفظ ما تقدم، اسکی تشخیص کے طریقون، علاج و مجربات وغیرہ دق کے مرض اور علاج کے جملہ پہلوؤں پر ویدک، یونانی، ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، طب آبی، طب کونی وغیرہ مختلف طبون کے ہندوستان اور بیرون ہند کے ماہر اور نامور اطبا کے مبسوط و محققانہ مضامین ہین، اور دنیا کے مختلف ملکون، قومون اور نسلوں میں دق کی رفتار، ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ مین اس کے انسداد کی کوششوں، اس کے نتائج اور ان کی صحت گاہوں اور صحت و موت کے نقشوں کی تفصیلات ہیں، یہ اس نمبر کا سرسری خاکہ ہے، دق

اور سل کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے، جس پر اس نمبر میں طبی اور بین الاقوامی حیثیت سے نگاہ نہ ڈالی گئی ہو، تشخیص مرض سے متعلق چند فوٹو، اور دق سے متعلق چند افسانے بھی ہیں، اردو زبان میں اس موضوع پر معلومات کا اس سے بہتر مجموعہ نہیں مل سکتا، ہر طبقہ کے اطبا کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے،

**عالمگیر خاص نمبر**، مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہر پتہ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول، سنجیدہ مضامین، دلچسپ افسانوں اور ستھری نظموں کا یہ ضخیم خاص نمبر نکالا ہے، ادب اور افسانہ کے ساتھ متعدد علمی مضامین بھی ہیں، ان میں مولینا محمد امین صاحب عباسی چریاکوٹی کا "ناتمام مضمون" "ہندی اور عربی کے ہم معنی اشعار" کامل رزاقی صاحب کا "نظامی عروضی" ماسٹر ممتاز حسین صاحب کا "وسط ایشیا" اچھے، اور مفید مضامین ہیں، افسانوں میں آسی صاحب رام نگری کا افسانہ "بچی" بہت خوب ہے، اور بہت سے دلچسپ افسانے ہیں، عموماً خاص نمبروں میں مفید علمی مضامین کم ہوتے ہیں، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ان میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی، اگر مدیر صاحبان اس نظر سے مضامین کو دیکھ لیا کریں کہ ان میں کوئی جدت و اضافہ ہے، یا محض پرانی باتیں طرز بدل کر دہرادی گئی ہیں، تو رسالے بڑی حد تک حشو و زوائد سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ عالمگیر کا یہ نمبر بھی اس نقص سے خالی نہیں ہے، پھر بھی بہت غنیمت ہے، کچھ مضامین تو مفید نظر آتے ہیں، ورنہ عموماً وہی سیکڑوں مرتبہ کی لکھی ہوئی باتیں الفاظ اور طرز بدل کر دہرائی جاتی ہیں،

**شاہکار جدید اردو شاعری نمبر** | مرتبہ جناب حکیم عارف بلگرامی، تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ دفتر شاہکار گورکھپور،

رسالہ شاہکار نے جدید اردو شاعری پر یہ کامیاب اور مفید نمبر نکالا ہے، یہ نمبر تین حصوں میں تقسیم ہے پہلا حصہ تاریخ ادب میں، اردو شاعری کی مختصر تاریخ ہر دور کے اساتذہ کے کلام کی خصوصیات، جدید دور کے



مشہور ناظمین، متغزلین، اور شاعر خواتین کے بقدر تعارف حالات، ان کے کلام پر مختصر تبصرہ اور نمونہ کلام ہے، دوسرا حصہ "تنقیدی مقالات" میں موجودہ دور کے بعض مشہور شعراء اقبال، ریاض، جگر، سیماب، اور جوش کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس حصہ میں "اقبال کی فلسفیانہ منزلت" اور "کلام جگر" اچھے مضامین ہیں، لیکن ان شعراء کے ساتھ اختر انصاری کا کیا جوڑ تھا، یہ صحیح ہے کہ وہ ہونہار شاعر ہیں، اور ان کے کلام میں ترقی کے آثار نمایاں ہیں، لیکن شادانی صاحب کا مضمون بہت مبالغہ آمیز ہے، ایسی شرح وتفسیر سے تو ہر رائی کو پہاڑ بنایا جا سکتا ہے، ایک طرف تو شادانی صاحب کے معیار کی بلندی کا یہ حال ہے کہ موجودہ دور کا کوئی ایسا بڑا شاعر نہیں ہے، جس کے کلام پر انھوں نے مضحک تنقید نہ کی ہو، دوسری طرف ایک نوخیز شاعر کو الہامی بنائے دیتے ہیں، تیسرے حصہ "تعمیری امکانات" میں فراق گورکھپوری کا مضمون "غزل اور نظم پر پریشاں خیالات" بہت اچھا ہے، "اردو شاعری کا مستقبل" بھی بعض پہلوؤں سے مفید مضمون ہے، لیکن تغزل سے بیزاری گوارا نہ تقلیداً اس میں بھی ہے، یہ نیا انکشاف ہے، کہ "غالب کمال فن اور مشق سخن کی بنا پر بڑے شاعر نہ تھے، بلکہ اس لئے بڑے ہوگئے کہ سوسائٹی میں ان کا درجہ بڑا تھا، اور حسرت موہانی محض اپنی لیڈری کی وجہ سے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں" یہ تحقیق حسن مذاق کی کتنی اچھی مثال ہے، یہ جدت پسندی کی عجیب قسم ہے، "کرشن پور بنگلوں" کا حسن دکھانے کے لئے "تاج محل" کی مذمت ضروری سمجھی جاتی ہے، بہرحال اس نمبر میں جدید اردو شاعری اور اسکے آیندہ رجحانات کے متعلق کافی معلومات ہیں،

**نیرنگ خیال افغانستان نمبر**، مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۸ر پتہ دفتر نیرنگ خیال بیڈن روڈ لاہور،

نیرنگ خیال نے اسلامی حکومتوں پر ایک ایک خاص نمبر نکالنے کا اچھا اور مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے عام لوگوں کو اسلامی حکومتوں کے ضروری حالات سے سرسری واقفیت ہو جاتی ہے

یہ نمبر افغانستان پر ہے، اس میں افغانستان کی موجودہ حکومت کی ترقیوں کے حالات ہیں، امان اللہ خان کی حکومت کا زوال، موجودہ حکومت کا قیام اسکی سیاسی علمی تعلیمی، اقتصادی اور مختلف تمدنی ترقیان، ارکان و عمائد سلطنت کے حالات ان کے کارنامے، افغانستان کا مختصر جغرافیہ، اسکی پرانی سیاسی تاریخ مختلف حکومتوں کے ساتھ اس کے تعلقات اور معاہدے، افغانستان اور ہندوستان کا تعلق وغیرہ افغانستان سے متعلق اور بہت سے معلومات ہیں، لیکن "رسالہ کابل" کے خاص نمبروں کو سامنے رکھکر اس سے زیادہ کامیاب نمبر نکالا جا سکتا تھا،

**مصر نمبر** تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۵ر

یہ نمبر مصر کے حالات میں ہے، اس میں مصر کا مختصر جغرافیہ طبعی حالات، عہد فراعنہ اور قدیم اسلامی دوروں اور حکومتوں کی بقدر تعارف تاریخ اور جدید دور کے کسی قدر تفصیلی حالات ہیں، جدید دور میں مصر کے سیاسی انقلابات، آزادی کی جدوجہد اس کے نتائج اور موجودہ حکومت کے اجمالی حالات ہیں، اکابر مصر کا مختصر تعارف بھی ہے، ضمناً یونہی سے کچھ علمی و تمدنی حالات بھی آگئے ہیں، مصر کے قدیم و جدید دونوں دوروں کے متعلق تنہا عربی میں اتنا کافی مواد موجود ہے، کہ اسکی مدد سے مصر کی پوری تاریخ لکھی جا سکتی ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر بہت ناکافی ہے لیکن عام لوگوں کے لئے جنکو مصر کے حالات سے بالکل ناواقفیت ہے، بُرا نہیں ہے،

**عصمت سالگرہ نمبر**، مرتبہ جناب رازق الخیری صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۰ر پتہ:۔ دفتر عصمت دہلی،

عورتوں کے مقبول عام رسالہ عصمت کی نیسویں سالگرہ کی تقریب میں رازق الخیری صاحب نے یہ سالگرہ نمبر نکالا ہے، اس میں مختلف ذوق کے دلچسپ مضامین اور مفید معلومات ہیں، لیکن رسالہ کے موضوع کے لحاظ سے نسوانی ضروریات کے مضامین نسبۃً کم ہیں، ابتدا میں تیسوین سال کی مضمون نگار



خواتین کے مضامین پر تبصرہ ہے، اس سے ہماری خواتین کے ذوق اور انکی علمی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب کا مضمون "بچے کی غذا" نسوانی ضروریات کے مضامین میں مفید مضمون ہے، "اتنی بلند" "مکان کی آرائش" کی کم عورتون کو ضرورت ہوگی، غریبانہ آرائش اور صفائی کی تعلیم ناظرات عصمت کے لئے غالباً زیادہ مفید ہوتی، لیکن کچھ خواتین کے لئے یہ بھی کام کی چیز ہے، صالحہ عابد حسین صاحبہ کا ڈرامہ "انگھ کا ڈاکٹر" بہت خوب ہے، "کنجوس بھی" دلچسپ افسانہ ہے، نظم کے مضامین کے علاوہ متعدد ستھری نظمیں بھی ہیں مجموعی حیثیت سے کامیاب نمبر ہے،



## نئے رسالے

**برُہان** مرتبہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی فاضل دیوبند تقطیع بڑی ضخامت ۶۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ ۵ر پتہ:۔ قرول باغ دہلی،

موجودہ علمی مقتضیات اور ضروریات زمانہ کے مطابق مسلمانوں کی علمی اور مذہبی خدمت کیلئے ندوۃ المصنفین کے نام سے دہلی میں ممتاز علماء نے ایک علمی مجلس قائم کی ہے، اس کے حالات اخبارات میں نکل چکے ہیں، اس مجلس کے اغراض و مقاصد موجودہ ضروریات کے لحاظ سے نہایت مفید اور بڑی حد تک دار المصنفین سے ملتے ہوئے ہیں، برہان اسی مجلس کا علمی رسالہ ہے، ابھی اس کا صرف پہلا نمبر نکلا ہے، اس میں "نظرات" کے زیر عنوان برہان کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے، غالباً آیندہ سے اس میں مسلمانوں کے مسائل حاضرہ پر بحث ہوا کرے گی، "نظرات" کے بعد مضامین ہیں، لطائف ادبیہ میں منظومات ہوتے ہیں "شئون علمیہ" میں علمی خبریں، لیکن اس مہینہ کے مندرجہ واقعات کو علمی خبروں سے تعلق نہیں معلوم ہوتا، "نقد و نظر" میں مطبوعات پر ریویو ہوگا، مقالات میں مولینا محمد ادریس صاحب میرٹھی نے "سحر و صابئیت" کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے، مولانا حامد الانصاری نے "ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے مستقبل پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے، پروفیسر یعقوب الرحمن صاحب

عثمانی نے "انسانیت کے لئے مذہب کی ضرورت" دکھائی ہے، یہ مضامین فائدہ سے خالی نہیں ہیں، خصوصاً مولانا حامد الانصاری کا مضمون اچھا ہے، لیکن مجلس کے مقاصد کے لحاظ سے مضامین کی نوعیت اور معیار دونوں کے بدلنے کی ضرورت ہے، یہ پہلا پرچہ ہے، اس کی ترتیب میں دشواریاں زیادہ رہی ہونگی، امید ہے کہ ابتدائی مشکلات کے دور ہونے کے بعد پرچہ مجلس کے معیار کے مطابق ہو جائیگا، اس رسالہ کے اجراء سے اچھے علمی رسائل میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے،

**قائد** مرتبہ مولینا سید اختر اسلام صاحب قاسمی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت باختلاف کاغذ سالانہ ۱۲؍ اور عہ ششماہی ۱۲؍ اور ۱۲؍ پتہ قائد مرادآباد دیوبی،

یہ مفید رسالہ چند مہینوں سے مرادآباد سے نکل رہا ہے، اس کا مقصد "سیر طیبہ اور سیر صحابہ کی روشنی میں مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اصلاح، قدیم وجدید قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے مسلمانوں کے جذبات ترقی کو بیدار کرنا، عربی خوان طلبہ میں عربی زبان کا ذوق پیدا کرنا، اور ہندوستان اور حجاز کے درمیان صحافتی رابطہ کا قیام ہے" اگرچہ یہ مقاصد نہایت اہم ہیں، لیکن خوش قسمتی سے رسالے قائد کو صاحب علم ونظر اور حالات زمانہ سے واقف علماء کی سرپرستی اور ان کی قلمی امداد حاصل ہے اس لئے ان مقاصد میں کامیابی کی توقع کیجا سکتی ہے، اس رسالہ میں مسلمانوں کی دینی ضروریات اور دنیوی مصالح کو نہایت ہم آہنگی کے ساتھ سمویا گیا ہے، مفید مذہبی اور تاریخی مضامین کیساتھ سیاسی مقالات خصوصاً مسلمانوں کی سیاست پر سنجیدہ تبصرہ، اور لائق غور مشورے ہوتے ہیں، سیرت نبوی، سیر صحابہ رض ترجمہ ابن کثیر فقہی مسائل اور بہت سے مذہبی موضوعوں میں مفید اور مسلسل مضامین نکل رہے ہیں "اسلام اور آئین حکومت" "اقتصادیات مسلم" اور "فلسفہ ایمان" کا سلسلہ زیادہ مفید ہے، "رنات الطرب" کے عنوان کے تحت مولینا عبدالحق صاحب مدنی کا عربی مضمون "السیاسیہ فی الاسلام" مسلسل نکل رہا ہے، یہ سب کے سب مضامین مفید اور اچھے ہیں، لیکن اس تنوع اور کثرت کیساتھ ہر مہینہ ان کی پابندی سے نہ مضامین کا معیار قائم رہ سکتا ہے اور نہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ہر نمبر میں بکثرت ناقص مضامین شائع کرنے سے بہتر ہے، کہ وقتاً فوقتاً ان موضوعوں پر مضامین ہوا کریں،



**طلوع اسلام** مرتبہ جناب حکیم ذکی احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ۰صرفی پرچہ ۰، پتہ قرول باغ دہلی،

رسالہ "طلوع اسلام" کئی سال تک جناب نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلنے کے بعد بند ہو گیا تھا، اب وہ دوبارہ نئے انتظامات کے ساتھ حکیم ذکی احمد صاحب کی ادارت میں نکلا ہے، اب اسکا انتظام واہتمام ایک جماعت کے ہاتھ میں ہے، اس کا مقصد "ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ کی نقابت اور مسلمانوں کی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن پاک سے پیش کرنا، اور پیام اقبال کی اشاعت ہے" یہ دونوں مقاصد نہایت مبارک ومحمود ہیں، اور طلوع اسلام اپنے خاص نقطۂ نظر سے ان مقاصد کے تحت مسلمانوں کے دینی مسائل اور مختلف اسلامی موضوعوں پر علمی مضامین پیش کرتا ہے، لیکن جمہور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مذہب اور سیاست دونوں میں خصوصاً بعض مذہبی پہلوؤں میں اس کے خیالات ومعتقدات خالص جماعتی اور عام مسلمانوں کے مسلک سے بالکل علٰحدہ ہیں، اور بعض اصول تو بالکل ناقابل فہم اور بعید از قیاس ہیں، مثلاً فہم وتفسیر قرآن میں صحابہ کرام رضی کی روایات، عربی زبان، لغت اور قواعد سے نہ صرف بے نیازی، بلکہ اس عجیب وغریب ادعا کی بنیاد پر ان کی بے اعتمادی کہ "روایات صحابہ رضی مشتبہ اور غیر یقینی ہیں، لغات سماعی ہیں، ان کے جامع تمامتر عجمی تھے، زبان کے قواعد نزول قرآن کے مدتوں بعد مدون ہوئے" سمجھ میں نہیں آتا، کہ فہم قرآن کے ان تمام وسائل کی بے اعتباری کے بعد پھر قرآن سمجھنے کا ذریعہ اور کون رہ جاتا ہے، زید، عمرو وبکر کے اجتہادات؟ نہ صرف قرآن اور عربی زبان بلکہ لغت اور قواعد زبان کو نظر انداز کر دینے کے بعد دنیا کی کونسی زبان سمجھی جا سکتی ہے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" کی یہ تفسیر آجتک کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی، اس قسم کے بظاہر صحیح اور خوشنما اور باطن

بے معنی دعوون کے متعلق حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "کلمۃ حق ارید بہا الباطل"، اسی اصول یا بے اصولی کا نتیجہ ہے، کہ قرآن کی آیات کے ترجمہ تک میں غلطیاں ہیں، اور ان سے استدلال تو اور غلط در غلط ہے، افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرہ میں ان خودساختہ اصولون پر تفصیلی تنقید کی گنجایش نہیں، کہ یہ بحث ایک مستقل مضمون کی طالب ہے، یہی حال طلوعِ اسلام کی سیاسی تعلیمات کا ہے، بیشک اسلام خود ایک مستقل قومیت ہے، لیکن اسے اتنا محدود کر دینا کہ اسلام اور مسلمانون کے فائدہ کے لئے بھی غیر مسلمون کے ساتھ اشتراکِ عمل کی گنجایش باقی نہ رہے، نہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح ہے، اور نہ مسلمانوں کیلئے مفید، ان غلط اصولوں کو چھوڑ کر علمی حیثیت سے طلوعِ اسلام میں اچھے اور مفید مضامین بھی ہوتے ہین،

**الفلاح** مرتبہ مولوی منیر احمد صاحب نعمانی، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ عہ [illegible] پرچہ ۲ر، پتہ الفلاح بلڈنگ بازار پرتاب گڈھ،

یہ مفید مذہبی اور اصلاحی رسالہ چند مہینوں سے نکل رہا ہے، عام مسلمانوں کی مذہبی واقفیت اور اصلاح کے لئے اچھا رسالہ ہے، مختلف مذہبی پہلوؤں پر عام فہم سادہ و دلنشین اور موثر مضامین ہوتے ہیں مئی اور جون کا مجموعی نمبر ہمارے سامنے ہے، قریب قریب سب مضامین مفید اور سبق آموز ہین مولینا معظم علی صاحب کا مضمون "وحی نبوت" مولوی ادریس صاحب نگرامی کا "یادِ رفتگان"، اور مولوی نجم الحسن صاحب وکیل کے سادہ اور دلنشین مضامین خاص طور سے عام مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہیں، لیکن رسالہ کی ترتیب ابھی مزید توجہ کی محتاج ہے،

**فردوس** مرتبہ جناب حکیم حبیب اشعر صاحب دہلوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، قیمت سالانہ فی پرچہ ۲ر، پتہ دفتر فردوس دہلی،

یہ رسالہ حال میں دہلی کے خوشگو شاعر حبیب اشعر صاحب کی ادارت میں نکلا ہے، بیشتر مضامین ادبی اور بعض اصلاحی اور تاریخی بھی ہوتے ہین، ابھی اسے اوسط معیار پر لانے کے لئے بھی کافی توجہ کی



ضرورت ہی "جبل القمر" اصلاحی نقطۂ نظر سے اچھا افسانہ ہے، لیکن زبان کی تلخی کے بغیر بھی اسے پیش کیا جا سکتا تھا، مولانا ابوالکلام کا مضمون "قصرِ حسنی" غالباً ان کی طالب علمی کے زمانہ کا ہے، جسے کسی پرانے پرچہ سے بلا حوالہ نقل کر دیا گیا ہی،

**ترجمان** مرتبہ جناب سید معین الدین صاحب ایم اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ ۸ر، پتہ انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان مرکزیہ دہلی

روس کی اشتراکی حکومت کے مظالم سے تنگ آکر ترکستان کے لاکھوں مسلمان ترکِ وطن کر کے مختلف ملکوں میں بس گئے ہیں، ان کی ایک جماعت ہندوستان میں بھی آباد ہو گئی ہے، "انجمن اتحادیہ مہاجرین بخارا و ترکستان" کے نام سے دہلی میں انکی ایک انجمن ہے، رسالہ مذکور اسی کا ترجمان ہے، اپنی جماعت کی ترجمانی کے ساتھ اس میں مذہبی، اخلاقی اور اسلامی پہلوؤں پر معمولی درجہ کے مضامین ہوتے ہین، اس کا امتیازی وصف ترکستان کے مسلمانون کے حالات ہین، اگر ان کے تصویر [illegible] کا کوئی معقول اور قابلِ وثوق ذریعہ ہو تو یہ مفید چیز ہو گی، اڈیٹر کے قلم سے "زندگی کا اسلامی تصور" اچھا مضمون ہے، اس لحاظ سے زبان کے اغلاط کی شکایت بے کار ہے، کہ یہ رسالہ غیر ہندوستانی جماعت کا ہے، لیکن اڈیٹر صاحب کی توجہ سے یہ خامی آسانی کے ساتھ دور ہو سکتی ہے،

**سادات** مرتبہ سید زاہد حسین صاحب کاظمی، تقطیع اوسط، ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ عہ، فی پرچہ ۲ر، پتہ سادات دواخانہ جامع مسجد دہلی

یہ رسالہ سادات دواخانہ کیجانب سے نکلا ہے، اصل میں طبی رسالہ ہے، لیکن عام دلچسپی کیلئے طبی مضامین کیساتھ معمولی درجہ کے ادبی مضامین بھی ہوتے ہین،

## اخبارات

**مسلم لیگ**، مرتبہ جناب شاہ خلیل الرحمن صاحب بی اے، تقطیع بڑی اخباری ضخامت

۱۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ ؏ ششماہی سے، سہ ماہی ۸ فی پرچہ ۱ پتہ۔
مراد پور بانکی پور، پٹنہ

یہ سہ روزہ اخبار پٹنہ سے نکلا ہے، اس کی پالیسی اسکے نام سے ظاہر ہے، بہار میں مسلم لیگ کا پروپگنڈا لیگی مسلمانوں کی ترجمانی اور ان کے نقطۂ نظر سے وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اس کا مقصد ہے، صوبہ بہار میں مسلم لیگ کی رفتار اور اسکی تفصیلی خبریں ہوتی ہیں، اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے حکومت بہار اور وہاں کے سیاسی حالات پر نقد و تبصرہ بلکہ مواخذہ ہوتا ہے، اب کانگریسی اور مسلم لیگی مسلمانوں کا اختلاف اس حد سے گذر چکا ہے، کہ اصولی حیثیت سے دونوں میں سے کسی کے مسلک کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو یا انھیں ایک نقطہ پر متحد کرنے کی کوشش کیجائے موجودہ حالات میں فریقین کا جادۂ تہذیب و متانت پر قائم رہنا ہی غنیمت ہے، ابھی اس اخبار کے صرف چند نمبر نکلے ہیں، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قسم کا نمونہ پیش کریگا،

**آگ** مرتبہ جناب خلیق ابراہیم صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ پتہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنؤ،

لکھنؤ کا سیاسی اکھاڑا آجکل اخبارات کا بھی دنگل بن رہا ہے، آئے دن نئے نئے اخبارات نکلتے رہتے ہیں ان ہی میں یہ تازہ ہفتہ وار اخبار ہے، جدید ہندوستان کا ہر نوجوان لینن اور ٹراٹسکی بننے کی آرزو رکھتا ہے، اس کی رگوں میں جو آتش سیال بھری ہے، اسی سے یہ شعلہ بھی پھوٹا ہے جس کی ہر سطر سے شرارے نکل رہے ہیں، چنانچہ اس کا اڈیٹوریل اس مصرع سے شروع ہوتا ہے، ع

گھبرا گیا ہوں نور سے ہے نار کی تلاش

آگے چل کر آگ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے، رجعت پسندی رسوم و رواج کی لعنت ہندوستان کو روز بروز تباہی سے قریب کرتی جاتی ہے...... مذہب کی آڑ میں انسانوں کے پوتر خون کی ہولیاں کھیلی جا رہی ہیں.... آگ رجعت پسندی کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہے" اس آتش باری سے قیاس ہوتا ہے، کہ زمانہ پھر علاء الدین جہانسوز کی مثال زندہ کرنے والا ہے، پریم چند ہو کر یہ شعلہ فشانی اور ابراہیم ہو کر یہ آتش پرستی! انقلاب کا یہ پہلا کرشمہ ہے! بہرحال یہ زمانہ کی رو ہے جس کا روکنا مشکل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمان نوجوان اس کا زیادہ شکار ہو رہے ہیں، اگر یہ انقلاب سیاسی خیالات تک محدود رہتا، تو غنیمت تھا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انقلاب کے یہ شعلے ان کے مذہب تہذیب و تمدن سب کو بھسم کئے ڈالتے ہیں اس اخبار کا مقصد، بے مہار انقلاب اور روسی اشتراکیت کی تبلیغ ہے، ابھی اس کا صرف ایک نمبر نکلا ہے، اس لئے اس کے مضامین پر تفصیلی تنقید کا موقع نہیں ہے، یہ نمبر کارل مارکس کے مقالہ اور "باغی" کے ترانے سے مزین ہے،



**الاصلاح** مرتبہ علی جان صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت فی پرچہ ار پتہ دفتر الاصلاح اسمعیلی پریس ڈونگری ب

خوجہ جماعت کا یہ اخبار کئی مہینہ سے بمبئی سے نکل رہا ہے، بڑا حصہ اردو کا ہوتا ہے، اور چند صفحات گجراتی کے، علمی ادبی تاریخی ہر ذوق کے ہفتہ وار اخبار کے معیار کے مضامین اور مختلف قسم کے مفید معلومات پیش کرتا ہے، سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں، اسلامی مسائل پر بحث و نظر کا خاص اہتمام ہے، اگرچہ یہ اخبار ایک خاص جماعت کا ہے، لیکن اخبار کی پالیسی اور مضامین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے، بلکہ وہ ہر اسلامی فرقہ کا یکساں خیر خواہ ہے، مسلمانوں کے فرقہ وار اخبارات کو اس سے سبق لینا چاہئے،

**سدا بہار** مرتبہ اے ایچ انصاری صاحب و دیس راج ودھاون تقطیع بڑی ضخامت ۲۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ فی پرچہ ار پتہ:- موہن لال روڈ لاہور،

یہ ہفتہ وار اخبار عرصہ سے لاہور سے نکل رہا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کیلئے آیا ہے، ادبی اخبار ہے، بڑا حصہ ادب افسانے اور متفرق دلچسپ معلومات کا ہوتا ہے، کبھی کبھی سنجیدہ موضوع پر بھی مضامین نظر آجاتے ہیں، سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں عام دلچسپی کیلئے خاصا اخبار ہے،

"م"

۱۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ صہ ششماہی سے ر سہ ماہی عہ فی پرچہ ۱ مرتبہ۔

مراد پور بانکی پور، پٹنہ

یہ سہ روزہ اخبار پٹنہ سے نکلا ہے، اس کی پالیسی اسکے نام سے ظاہر ہے، بہار میں مسلم لیگ کا پروپگنڈا لیگی مسلمانوں کی ترجمانی اور ان کے نقطۂ نظر سے وہاں کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اس کا مقصد ہے، صوبہ بہار میں مسلم لیگ کی رفتار اور اسکی تفصیلی خبرین ہوتی ہین، اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے حکومت بہار اور وہان کے سیاسی حالات پر نقد و تبصرہ بلکہ مواخذہ ہوتا ہے، اب کانگریسی اور مسلم لیگی مسلمانوں کا اختلاف اس حد سے گذر چکا ہے، کہ اصولی حیثیت سے دونوں میں سے کسی کے مسلک کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو یا انھیں ایک نقطہ پر متحد کرنے کی کوشش کیجائے موجودہ حالات میں فریقین کا جادۂ تہذیب و متانت پر قائم رہنا غنیمت ہے، ابھی اس اخبار کے صرف چند نمبر نکلے ہیں، اس لئے نہیں کہا سکتا کہ وہ کس قسم کا نمونہ پیش کریگا،

**آگ** مرتبہ جناب خلیق ابراہیم صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ پتہ دفتر آگ جھوائی ٹولہ لکھنو،

لکھنؤ کا سیاسی اکھاڑا آجکل اخبارات کا بھی دنگل بن رہا ہے آئے دن نئے نئے اخبارات نکلتے رہتے ہیں ان ہی میں یہ تازہ ہفتہ وار اخبار ہے، جدید ہندوستان کا ہر نوجوان لینن اور ٹراٹسکی بننے کی آرزو رکھتا ہے، اس کی رگون میں جو آتش سیال بھری ہے اسی سے یہ شعلہ بھی پھوٹا ہے جس کی ہر سطر سے شرارے نکل رہے ہیں، چنانچہ اس کا اڈیٹوریل اس مصرع سے شروع ہوتا ہے، ع

گھبرا گیا ہوں نور سے ہے نار کی تلاش

آگے چل کر آگ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں، رجعت پسندی رسوم و رواج کی لعنت ہندوستان کو روز بروز تباہی سے قریب کرتی جاتی ہے...... مذہب کی آڑ میں انسانوں کے پوتر خون کی ہولیان کھیلی جا رہی ہیں....



آگ رجعت پسندی کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہے،" اس آتش باری سے قیاس ہوتا ہے، کہ زمانہ پھر علاء الدین جانسوز کی مثال زندہ کرنے والا ہے، پریم نبد ہو کر یہ شعلہ فشانی اور ابراہیم ہو کر یہ آتش پرستی! انقلاب کا یہ پہلا کرشمہ ہے! بہرحال یہ زمانہ کی رو ہے، جس کا روکنا مشکل ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمان نوجوان اس کا زیادہ شکار ہو رہے ہیں، اگر یہ انقلاب سیاسی خیالات تک محدود رہتا، تو غنیمت تھا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انقلاب کے یہ شعلے ان کے مذہب تہذیب و تمدن سب کو بھسم کئے ڈالتے ہین، اس اخبار کا مقصد، بے پناہ انقلاب اور روسی اشتراکیت کی تبلیغ ہے، ابھی اس کا صرف ایک نمبر نکلا ہے، اس لئے اس کے مضامین پر تفصیلی تنقید کا موقع نہیں ہے، یہ نمبر کارل مارکس کے مقالہ اور "باغی" کے ترانے سے مزین ہے،

**الاصلاح** مرتبہ علی جان صاحب تقطیع اوسط ضخامت ... صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت فی پرچہ ار پتہ دفتر الاصلاح اسمٰعیلی پریس ڈونگری ب...

خوجہ جماعت کا یہ اخبار کئی مہینہ سے بمبئی سے نکل رہا ہے، بڑا حصہ اردو کا ہوتا ہے، اور چند صفحات گجراتی کے علمی ادبی تاریخی ہر ذوق کے ہفتہ وار اخبار کے معیار کے مضامین اور مختلف قسم کے مفید معلومات پیش کرتا ہے، سیاسی خبرین بھی ہوتی ہیں، اسلامی مسائل پر بحث و نظر کا خاص اہتمام ہے، اگرچہ یہ اخبار ایک خاص جماعت کا ہے، لیکن اخبار کی پالیسی اور مضامین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے، بلکہ وہ ہر اسلامی فرقہ کا یکساں خیرخواہ ہے، مسلمانوں کے فرقہ وار اخبارات کو اس سے سبق لینا چاہئے،

**سدا بہار** مرتبہ اے ایچ انصاری صاحب ودیس راج ودھاون، تقطیع بڑی ضخامت ۲۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ فی پرچہ ار پتہ:- موہن لال روڈ لاہور،

یہ ہفتہ وار اخبار عرصہ سے لاہور سے نکل رہا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کیلئے آیا ہے، ادبی اخبار ہے، بڑا حصہ ادب، افسانے اور متفرق دلچسپ معلومات کا ہوتا ہے، کبھی کبھی سنجیدہ موضوع پر بھی مضامین نظر آجاتے ہیں، سیاسی خبرین بھی ہوتی ہیں، عام دلچسپی کیلئے اچھا اخبار ہے۔

"م"

# مطبوعات جدیدہ

**کمپنی کی حکومت** مولفہ اشتراکی ادیب باری تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر مجلد قیمت للعہ پتہ مکتبہ اردو لاہور،

ایسٹ انڈیا کمپنی کا دورِ حکومت ہندوستان کی تباہی و بربادی کی خونچکان داستان ہے، اس دور کے حالات میں انگریزوں نے اپنے نقطۂ نظر سے بہت سی کتابیں لکھیں، اس لئے ان کی صحت ظاہر ہے، ہندوستان میں اس موضوع پر بی ڈی باسو کی انگریزی تصنیف "ہندوستان میں نصرانی اقتدار کا عروج" نہایت مشہور و مستند کتاب ہے، جس کا جواب آج تک انگریزوں سے نہ ہوسکا، اس کتاب میں انگریزی سیاست کو اچھی طرح بے نقاب کیا گیا ہے، اردو میں اس موضوع پر کوئی قابلِ ذکر کتاب نہ تھی، اشتراکی ادیب باری صاحب نے مذکورۂ بالا کتاب لکھکر یہ کمی پوری کی ہے، یہ کتاب زیادہ تر مسٹر باسو کی کتاب سے ماخوذ ہے، اس میں ہندوستان میں انگریزوں کے داخلہ سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ تک ہندوستان کی تباہی کے حالات ہیں، کہ ابتدا میں کس طرح انگریز تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے، کس طرح انھوں نے اپنے حریف پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کو نکالا، پھر کس مکر و فریب اور ظلم و ستم سے ہندوستانی ریاستوں کو مٹا کر سارے ہندوستان پر قابض ہوگئے، اور کس بے دردی اور ظلم سے ہندوستان کی دولت لوٹ کر اسکو مفلس بنایا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں نے حصولِ زر کے لئے ہندوستان کے امرا اور یہاں کی رعایا پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے، اس سلسلہ میں دہلی کی حکومت، مرشد آباد، میسور، ارکاٹ اور اودھ کی نوابیوں، پنجاب، سندھ، ملتان، نیپال، بنگال اور دکن



کی ریاستوں، روہیلہ، سکھ، مرہٹہ اور پٹھان وغیرہ ان تمام حکومتوں اور قوتوں کے زوال اور خاتمہ کی تاریخ آگئی ہے، جو تیموری حکومت کے زوال کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں پیدا ہوگئی تھی، یہ کتاب انگریزوں کی پرفریب سیاست، خداعی، ان کے وحشیانہ مظالم، حرص وطمع اور شرافتِ انسانی سے عاری اخلاق کی بے نقاب تصویر ہے، اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انگریزوں نے جو مظالم ڈھائے ہیں اسکی مثال چنگیز و ہلاکو کی تاریخ میں بھی مشکل سے مل سکتی ہے، یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے نہایت سبق آموز اور ہندوستانیوں کے مطالعہ کے لائق ہے، ایک پہلو سے یہ انگریزوں کے مظالم کی خونیں داستان ہے، دوسرے پہلو سے ہندوستانی اُمراء کی ناعاقبت اندیشی، سادہ لوحی، باہمی رشک و رقابت، بزدلی، عمالان حکومت کی خود غرضی اور قوم فروشی کی شرمناک تاریخ ہے، تیسرے پہلو سے وہ اُن شہدائے ملت کی اولوالعزمیوں اور جذبۂ حریت کا زندہ جاوید پیام ہے، جو ہندوستان کی حفاظت کے لئے خود مٹ گئے، لیکن جیتے جی اسکی عزت کا علم سرنگوں نہ ہونے دیا، ہر ہندوستانی کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے، اندازِ بیان دلچسپ اور انشا پردازانہ ہے، اس سے طرزِ بیان میں دلکشی تو ضرور پیدا ہوگئی ہے لیکن کہیں کہیں واقعات کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے، تاریخ کیلئے ہر موقع پر یہ انداز مناسب نہیں،

**بیوہ** مولفہ منشی پریم چند تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۰ صفحے، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ مجلد پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ منشی پریم چند کا ایک اصلاحی افسانہ ہے، اس میں ہندو سوسائٹی کے ایک قابلِ اصلاح پہلو "عقدِ بیوگان" اور "بیوہ خانہ" کے قیام کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے، افسانہ کے اجزا، کی تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس کی خوبی کے لئے منشی پریم چند کا نام کافی ہے، اس میں بیوہ کی المناک زندگی، اس کے گوناگون مشکلات و مصائب، اصلاح کی ضرورت، اس راہ کی مشکلات، ایثار و قربانی تمام پہلوؤں

کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے، مختلف سیرتوں کی آمیزش نے اس درد انگیز افسانے کو دلکش بنا دیا ہے، منشی جی کے افسانوں کی جملہ خصوصیات اس افسانہ مین بھی موجود ہے، زبان کی لطافت و شیرینی پلاٹ میں روزمرہ کی زندگی کے سادہ واقعات سے نتائج کا استنباط انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی مصوری، ہر سیرت اپنی جگہ پر انسانی فطرت کا جاندار مرقع معلوم ہوتی ہے، "امرناتھ" اور "پریما" کی سیرت کا مرحلہ نہایت نازک تھا لیکن منشی جی کے سحر نگار قلم نے نہایت خوبی سے نباہا ہے،

**الکتاب الوحید**، مترجمہ قاری محمد اسمٰعیل صاحب مجددی مدنی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ :- مترجم خانقاہ معصومی متصل بازار نصر اللہ خان ریاست رامپور

فن تجوید و قرأت میں شیخ عبد اللہ بن ابراہیم، حمدوہ مکی کی کتاب "مفتاح التجوید" مستند کتاب ہے، قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی مدرس مدرسہ عالیہ رامپور نے جن کی زندگی کا بڑا حصہ حجاز میں گذرا اور وہیں انھوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی [illegible] شام و مصر وغیرہ کا سفر کرکے دنیاے اسلام کے مشہور قاریوں سے فن قرأت حاصل کرکے اس مین کمال پیدا کیا، ہندوستانی قاریوں کے استفادہ کے لئے "الکتاب الوحید کے نام سے "مفتاح التجوید" کا مع اصل عربی کے ترجمہ کیا ہے، اس فن میں مصنف اور مترجم کے کمال فن اور کتاب کی اہمیت ظاہر ہے، ہندوستانی قرار اور قرأت کے طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا،

**نغمۂ فردوس**، مصنفہ ماہنامہ درچودھری خوش محمد صاحب ناظر، تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت بے جلد عہ مجلد عہر پتہ :- ناظم انجمن ارباب ذوق لائل پور،

اردو شاعری سے ذوق رکھنے والے حضرات، چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سابق منسٹر ریاست کشمیر کے نام اور کلام سے ناواقف نہوں گے، ان کی بے مثل نظم "جوگی" نہایت مشہور و مقبول اور اردو شاعری میں سادگی اور تاثیر کا بہترین نمونہ ہے، چودھری صاحب کی مشق سخن طالب علمی ہی کے زمانہ سے جاری تھی، وہ مولینا حالی سے زیادہ متاثر تھے، نغمۂ فردوس ان کے مجموعۂ کلام کا پہلا حصہ ہے



یہ حصہ کئی اجزا پر تقسیم ہے "سروش غیب" اخلاقی اور صوفیانہ کلام، "افکار ملی" قومی اور ملی نظمین جو قومی جلسوں میں پڑھی گئیں، "یاد رفتگان" مراثی اور قطعات تاریخ وفات "تہنیات درباری" مدحیہ قصائد وغیرہ "مناظر قدرت" "مطائبات" ظریفانہ کلام "متفرقات" "غزلیات" "مثنوی ہیر و رانجھا" "رباعیات" ان کے کلام کی خصوصیات یعنی سادگی و تاثیر ان تمام نظموں میں موجود ہے، ارباب ذوق کو ان سے لطف اٹھانا چاہئے،

**مرقاۃ العربیہ** (عربی کی پہلی کتاب) مؤلفہ مولوی محمد عبد اللہ صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ :- انجمن ارباب ذوق لائل پور،

عربی کے طلبہ کو قرآن کے معنی سمجھنے کی استعداد تک پہونچنے کے لئے عرصہ لگتا ہے، مولوی عبد اللہ صاحب نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اس کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے، کہ صرف و نحو کے قوائد کی مثالوں کو قرآن پاک کی آیات سے جمع کیا ہے، کہ طالب علم شروع سے کلام اللہ کے معنی سے آشنا ہوتا جائے لیکن ایک بڑا نقص اس میں یہ ہے، کہ صرف مثالین دی گئی ہیں، ان سے متعلق قواعد نہیں بتائے گئے ہیں، اس لئے تنہا ان مثالوں کے معنی سے قرآن کے معنی سمجھنے کا منشا پورا نہیں ہوتا، اس لحاظ سے ان مثالوں کے معنی سمجھنا اور ترجمۂ قرآن پڑھنا دونوں برابر ہے یہ کتاب صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے، کہ پڑھانے والا صرف و نحو کے قواعد بتاکر ان مثالوں کو ان پر منطبق کرکے دکھاتا جائے، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری کتاب "کلید قرآن" میں جو غالبًا اس کے بعد کا حصہ ہے، اس کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اگر اسی کتاب میں مختصر قواعد بھی دیدیئے جاتے تو بہت مفید ہو جاتی تعلیمی تربیت کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب بھی مزید توجہ کی محتاج ہے،

**دہلی** مؤلفہ جناب محمود علی خان صاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- ۴ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

یہ دلچسپ کتاب جناب محمود علی خان صاحب نے بچوں کے لئے تالیف فرمائی ہے، اس میں آسان زبان اور دلپذیر انداز میں دلی کی پرانی تاریخ، ان فرمانرداؤں کا مختصر ذکر جن کے آثار دلی میں ہیں، اور دلی کی تمام مشہور تاریخی عمارتوں کے مختصر حالات ہیں، بچوں کی دلچسپی کے لئے بعض عمارتوں کے فوٹو بھی دیدیئے گئے ہیں، یہ کتاب بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

**پریم سوگ** مؤلفہ جناب حسام الدین خان صاحب غوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/ پتہ :- مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

یہ کتاب مصنف نے منشی پریم چند کی یادگار میں تالیف کی ہے، اس میں منشی جی کی سیرت اُن کی علمی و ادبی زندگی کے مختصر حالات اور فنی نقطۂ نظر سے ان کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی خصوصیات پر نقد و تبصرہ ہے، آخر میں ان کی تصانیف کی فہرست، مصنف کے نام ان کے چند خطوط اور "جواہر پارے" کے عنوان سے ان کے کچھ حکیمانہ اقوال ہیں،

**انعامی مقابلہ** مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۳/ پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی،

اس کتاب میں مولوی حسین صاحب صاحب نے "اُلو" کی دانائی اور بچوں کی شرارت کے بُرے نتائج کے دو دلچسپ قصے لکھے ہیں، یہ دونوں قصے چھوٹے بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی، قصہ سے متعلق تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، ان سے کتاب کی دلچسپی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، زبان نہایت سہل اور بچوں کے مذاق کے مطابق ہے،

"م"

---